ڈاکٹر سعادت سعید
وزیٹنگ، پروفیسر، استاد شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ

Heidegger made language the basic source of his inspiration. In Urdu poetry IftikharJalib and his New Poetry school of thought emphasized the exploration of 'being' through poetic language. They wrote different poetry with no or little concern with the expressions of traditional Urdu poetry. IfthikharJalib and his companions were fully convinced that language essentially has come into existence to project the ideas of man having concrete intimacy with subjective and objective nature. They have claimed that New Poets in their poems are creating new metaphors and symbols to express their unique emotions, experiences and thoughts. IftikharJalib as a founder of New Poetry in Urdu language has expressively theorized his new views about poetry in his articles. This article is written for presenting theoretical and practical aspects of New Poetry Movement in Urdu. InIftikharJalib's opinion, New Poets are working for reconstruction of language. During this process they convert words into things. At this point in poetry common meanings of the words cease to exist. Their common conceptions embrace special meanings. Here poetic logic comes to the forefront. This logic produces deep metaphorical and symbolic meanings. Drawing upon Heidegger's conceptual framework and IftikharJalib's theoretical views about New Poetry in Urdu, the present study reviews the distinctive features of this poetry.

اردو نظم میں جدیدیت کے مطالعے سے ہم پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ جدیدیت کا تصور جدلیاتی حقیقت رکھتا ہے۔ جدلیاتی حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے ہمہ وقت متغیر رہتی ہے، اس کے ناقص پہلو فنا ہوتے رہتے ہیں، پرانے عقائد نئے تقاصوں اور احتیاجات کے دوش پر تخریب کا شکار ہوتے ہیں، اس تخریب سے نئی تعمیر جنم لیتی ہے۔ یہ نئی تعمیر نئے عہد کے مزید نئے تقاضوں کے سیاق و سباق میں قدامت کا پیرہن اوڑھ لیتی ہے۔ نئے زمانے میں پرانے دور کا احیا ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ پرانا دور اپنے مخصوص تقاضے اور مخصوص احتیاجات رکھتا ہے اور نئے دور کے اپنے پہلو اور اپنی جہتیں ہوتی ہیں، نئے زمانے کے تقاضوں اور احتیاجات سے منحرف ہونا تخیل کی حیات پرور قوتوں سے منحرف ہونا ہے۔ ہر زمانے میں نئی اور پرانی نسل میں باہمی آویزش اور کشمکش کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔ اس کشمکش کا مثبت فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نئی نسل اپنی مستحکم بنیادوں کی تلاش اور جستجو کے لئے بڑی محنت اور ریاضت سے کام کرتی ہے۔ اس بات کے منفی رخ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یعنی یہ کہ پرانی نسل آزاد اور کشادہ فضا میں آنے کی بجائے نظریاتی انجماد اور یکسانیت کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ یوں بھی ادب مشین نہیں ہوتا کہ اس کے کل پرزوں کو گھما کر جس نوع کا کام لینا چاہیں لے لیں۔ ادب آزادی کے عالم میں ٹھاٹھیں مارنے والا، وسیع اور کشادہ سمندر ہوتا ہے۔ جس میں مختلف

النوع اور بوقلموں روئیں پیوست ہوتی رہتی ہیں ۔ نئی روئیں پیدا ہوتی ہیں ۔ پرانی رووٴں سے ٹکراؤ اور آویزش کا عالم وجود میں آتا ہے ۔ نئی روئیں نئے راستوں کی دریافت کے امکانات روشن کرتی ہیں ۔ مردہ جذبے کے احساس کا نئی رووٴں کا ہم قدم ہونا نا ممکنات میں سے ہے ۔

جدید اردو نظم کی تحریک کے ہر مرحلے پر اسی قسم کے انداز نظر سے پالا پڑا ہے۔ حالی کے دور سے لے کر آج تک جدید شاعری میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ۔ حالی کے عہد میں قدیم جاگیردارانہ فضا کی شاعری سے گریز کا عمل دکھائی دیتا ہے ۔ اس عہد میں نئے حالات کے مطابق شاعری میں حال کے لمحوں کے مسائل کا عمل دخل ہوا۔ نئے حالات کے مطابق ہیت کے تجربے بھی لازمی تھے چنانچہ یہ کام عبدالحلیم شرر اور عظمت اللہ خان نے انجام دیا ۔ رومانی تحریک کی پیدائش کے زمانے میں ہندوستانی معاشرے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ۔ معاشرے میں فرد کی آزادی کی ہلکی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ ان حالات کا ردعمل رومانی شاعری کے علمبرداروں کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے شعر و ادب کو صنعتی اور جاگیردارانہ معاشرے کی اقدار کا سیاق و سباق عطا کرتے ہوئے مزدور ،کسان اور عوام کی معاشی ،سیاسی اور فکری آزادی کے نعرے بلند کئے۔ نظم میں علامت نگاری کی تحریک کے زمانے میں نئے مغربی علوم اور فلسفوں سے پیدا شدہ طرز احساس طرز عمل کی صورت اختیار کرنے لگا تھا ۔ چنانچہ فرد کے باطن کی گہری اور تہہ در تہہ کیفیات کو گرفت میں لانے کا اہتمام ہوا ۔ نئی شاعری کے زمانے میں ابہام اور ابلاغ کے مسائل پیدا ہوئے ۔ قاری کے لئے نئی شاعری مبہم اور لایعنی ٹھہری ۔ نئے شاعروں نے اپنی ریاضت جاری رکھی ۔ ان کی نظمیں قاری کی توجہ حاصل کرنے لگیں ۔ نئی شاعری کے بعد آج کے عہد میں نظم میں فرد کے تجربات،واردات اور احساسات کی منتشر اور بکھری ہوئی داستان رقم ہو رہی ہے ۔ زمانہ اسے بھی قبول کر رہا ہے۔ ان تمام ادوار میں مواد کے ساتھ ہیئت کے تجربے بھی لازمی تھے چنانچہ اردو نظم میں ہیئتوں کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ آزاد ، حالی اور شرر کا زمانہ، رومانوی اور ترقی پسند شاعری کا دور آج کے عہد کی شاعری کے مقابلے میں قدیم زمانہ اور دور ہے ۔ آج کے عہد میں پرانی جدیدیت اور نئی جدیدیت کی اصطلاحیں وضع ہوئی ہیں، تجربات و احساسات کے ناقص پہلو فنا ہوئے، نئے عہد کے تقاضوں اور ضروریات نے نئے نئے تجربات احساسات کے نئے پہلو اور نئی جہتیں پیدا کیں۔ نظم کے ان ادوار میں نظم کے فنی پہلوؤں پر بھی توجہ دی جاتی رہی۔ عروض و فنون،زبان و گرائمر اور دیگر شعری لوازمات کی صورتیں بدل چکی ہیں ، بدل رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی۔

ن ۔م۔ راشد نے آزاد نظم کی تکنیک کے استعمال سے اردو شاعری کو بند گلی سے نکال کر ایک ایسے راستے پر ڈالا ہے جس کی وسعتوں کا سراغ آئندہ زمانوں کے شاعر ہی دے سکیں گے۔ یوں بھی اس کے فکری اور فنی انجماد کے معاملے بالائے طاق رکھے جا چکے ہیں۔ماورا سے گماں کا ممکن تک کا سفر ایک پر احتیاط منصوبہ بندی سے طے کرنے کے بعد ن ۔م۔ راشد نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا کہ اب ان کے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے چاروں شعری مجموعوں میں اپنی شاعرانہ لم یا جوہر کو مکمل طور پر منتقل کر چکے ہیں۔مزید برآں اس حقیقت سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے کہ زمانہ قیامت کی چال چلتا ہے اور اس کی تیز روی کے سامنے بڑے بڑے فیلسوف اور وقت سے آگے نکل جانے کی ڈینگیں مارنے والے دانشور کسی بھی طور ٹھہر نہیں سکتے۔ سو راشد صاحب نے اپنے فکری اور جذباتی امکانات کی فنی حد بندیاں کرنے کے بعد اپنی تکرار محض سے کوئی نسبت نہیں رکھی اور اس پر ان کے ایک مداح عظیم نے اپنی نئی شاعری کی لاج رکھنے کے لیے اعلان کر دیا کہ:

ہر شاعر کا ایک عہد بہر حال ضرور ہوتا ہے اور وہ اسی کے حوالے سے زندہ رہتا ہے۔ اس کا شعری تجربہ اس عہد کی سچائیوں ہی سے طاقت حاصل کرتا رہتا ہے۔ مگر یہ عہد زود یا بہ دیر ختم ضرور ہو جاتا ہے اور جوں ہی عہد بدلتا ہے شاعر کے لیے اس عہد کی سچائیاں بھی بدل جاتی ہیں۔ اب وہ نہ تو خود کو بدل سکتا ہے اور نہ ہی آنے والے عہد کو۔ لہٰذا اسے اپنے شعری سفر کا خاتمہ نظر آنے لگتا ہے اور راشد کہ نہایت حقیقت پسند شاعر تھے انہوں نے واقعتاً نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا۔[1]

اس تناظر میں نئے اردو ادب کی ایک توانا آواز انیس ناگی نے ن۔م۔ راشد کی دورِ آخر کی نظموں کو ''شعر کبیر'' کہہ کر انہیں لازوال داد دی اور اپنے پرانے خیالات پر جارحانہ نظر ثانی کی۔ نئی شاعری کی تحریک کی داغ بیل ڈالنے والے شاعر افتخار جالب نے بھی ن۔م۔ راشد کی علامتی وسعتیں رکھنے والی شاعری کو تمثالی تلازمہ کاری کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا اور اس سلسلے میں ان کی نظم ''سبا ویران'' پر تلازماتی محاکمہ آرائی کی۔ راشد کی شاعری کے وسیلے سے جہاں ان سے ماقبل کے کئی شاعروں کی روایتی شاعری کے چراغ گل ہوئے وہاں ان کے کئی معاصر جدید شاعر بھی اپنی صفیں لپیٹ چکے ہیں۔ن۔م۔ راشد جانتے تھے کے ہر زمانہ اپنے خیالات و افکار اپنے ساتھ لاتا ہے یوں جدلیاتی اصولوں کے مطابق ہر موجود نئی چیز کو آئندہ زمانوں کی نئی چیزوں کے سامنے پرانا ہونا ہی ہوتا ہے۔ ن۔م۔ راشد کی نظموں کو'' شعر کبیر'' کے زمرے میں رکھنے کے لیے ناگی صاحب کو سینٹ جان پرس کی شاعری کو نمونہ بنانا پڑا۔یعنی اس شاعری کو انہوں نے پرس کی طویل نظموں 'ہوائیں' اور 'برفیں' وغیرہ کے پس منظر میں رکھا اور ریت کے حوالے سے لکھی گئی راشد کی نظم کو ان کا شاخسانہ جانا۔

ن۔م۔ راشد نے نئے شاعروں کے لسانی تجربوں اور تشکیلوں سے کوئی زیادہ سروکار نہیں رکھا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے روایتی لفظیات کو روایتی حوالوں سے استعمال کیا ہو۔ان کی نظموں میں آنے والا ہر پرانا لفظ نئے 'خیالاتی کلوں' میں ڈھل کر اپنی معنوی ساختوں کو تبدیل کر لیتا ہے۔اس حوالے سے اگر ہم اوگڈن اور آئی۔اے چرڈز کی کتاب ''معنی کے معنی'' (The Meaning of Meaning by C. K. Ogden and I. A. Richards,) کا مطالعہ کریں تو لفظوں کے رنگ ڈھنگ ایک طلسم کدے کی صورت سامنے آئیں گے اور ہم کہہ اٹھیں گے کہ ''طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ''۔ ن۔م۔ راشد نے لفظ و معنی اور فکر و جذبہ کی ہم آہنگی کو ہمیشہ سامنے رکھا اور یوں ایک سحر کارانہ بہاؤ ان کے شعری اسلوب یا بیانیے کا جزو لاینفک بن گیا۔انہوں نے اپنی شاعری کے فنی و فکری لوازم کو اپنے شعور کے تابع رکھا اور یوں تلازماتی بہاؤ سے پیدا ہونے والی آٹو میشن سے خود کو محفوظ رکھا۔

نئی شاعری کے فکری و نظری سانچے کا مخصوص زاویہ اور منفرد رویہ اردو نظم کی روایت میں قابل شناخت ہے۔ نئی شاعری معاشرے کی ہر دم متغیر اور تبدیل ہوتی صورت حال کے خود کار اور فطری اظہار کو اولیت تفویض کرتی ہے۔ نئی شاعری کو واضح اور منفرد صورت عطا کرنے والے شعرا میں افتخار جالب، جیلانی کامران، عباس اطہر، انیس ناگی، سلیم الرحمٰن، اعجاز فاروقی، آفتاب اقبال شمیم، زاہد ڈار اور تبسم کاشمیری کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن ، ذوالفقار احمد، نسیم بخاری، اختر احسن، گوہر نوشاہی، راجہ فاروق حسن، ساقی فاروقی نے بھی نظم میں نئے عہد کے طرز احساس کو منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔

نئی شاعری ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ اپنا خاکہ تیار کرتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد کا زمانہ نئے پاکستانی فرد کے بچپن کا زمانہ تھا۔

تقسیم کا دور افراتفری اور چار سو پھیلے خونی درندوں کی لمبی لال زبانوں کا دور تھا۔ تشدد، دہشت اور خوف کے کوائف فرد کی فکری اور احساساتی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ معاشرتی احوال اور بین الاقوامی صنعتی، میکانکی اور صارفانہ تہذیب کے اثرات نے پسماندہ معاشروں میں بسنے والے افراد کو کھوکھلے پن اور احساس بے چارگی کے تحفے عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے فرد کی شخصیت مجروح اور کچلی ہوئی ہے۔ اسے ذاتی رائے کا استحقاق حاصل ہے۔ یہ استحقاق فرد کی داخلی شخصیت اور خارجی دنیا کے باہم متصادم ہونے سے جنم لیتا ہے۔ نیا شاعر نئے فرد کی آوازوں کو آزاد نظم میں منتقل کر رہا ہے۔ آزاد نظم بقول صفدر میر ''تشدد، دہشت اور جنون کے تجربات کے اظہار کے لئے زیادہ موزوں ہے''۔[۲] نئے شاعر کی نظموں میں تجرید، تلازمے اور تجسیم کا ملا جلا انداز نمایاں ہے۔ تجرید میں احساس اور فکر کی ساری چھپی ان چھپی صورتیں ہیولوں کی مانند موجود ہوتی ہیں۔ تلازمہ ان ہیولوں میں مماثل اور متضاد شکلیں تلاش کرتا ہے اور تجسیم لفظوں کو اشیا کا درجہ دیتی ہے۔ یوں ایک وسیع شعری و معنوی عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ قاری اور فنکار کے ذہنی اشتراک اور احساساتی سطحوں کی مماثلت کے بغیر نیا شعر بے معنی، مبہم اور پیچیدہ ٹھہرے گا۔

نئے شاعر کا اہم ترین وصف ابہام کی ارادی تخلیق ہے۔ ابہام ڈرامائی تناؤ پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ابہام کے ذریعے شاعری میں مختلف النوع تصورات، تلازمات اور امکانات کو فروغ ملتا ہے۔ یوں شعر کی جمالیاتی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابہام پر اس صورت میں اعتراض ممکن ہے جب شاعر اپنی بات موثر طور پر کہنے سے قاصر ہو، نئے شاعر کو اس حقیقت سے آگاہی ہے کہ مکمل ابلاغ خیال کی اہمیت کم کر دیتا ہے۔ وہ گھسی پٹی ترکیبوں اور کلیشوں سے احتراز کرتا ہے۔ قاری اگر نئے شاعر کے ابہام کو مقصد نہیں ذریعہ سمجھے تو اس پر نت نئے معنوی و فکری انکشافات کے دروازے کھلے رہیں گے۔

تجربے کی تخصیصی نوعیت مختلف افراد کے درمیان ذہنی بعد اور انداز فکر کی تفریق کا باعث ہے۔ انفرادیت کی مخصوص صورت ابہام پیدا کرتی ہے۔ نیا شاعر اپنی ذات کی سرچشمہ گاہ میں خارجی معروضات کی قلب ماہیت کے عمل میں مصروف ہے۔ نئے شاعروں کے ہاں اشیا کے درمیان نئے رابطے تلاش کرنے اور انہیں کیفیت اور خیال کے مطابق ایک اکائی اور وحدت کی شکل دینے کا رجحان نمایاں ہے۔ نئے شاعر کے ذہن میں موضوع تصویروں اور تمثالوں کی صورت میں آتا ہے۔ یہ تصویریں اور تمثالیں مجرد بھی ہوتی ہیں، ٹھوس بھی اور ٹھوس اور مجرد کے امتزاج سے بھی تشکیل پاتی ہیں۔ نئے شاعر کے ہاں مضمون یا موضوع کسی منصوبہ بندی یا شعوری ارادے کی بدولت اظہار نہیں پاتا بلکہ وہ آزاد تلازم کے تحت کسی شے کو گرفت میں لاتا ہے۔ یہ کیفیت اپنی ارتقائی صورت میں جن تمثالوں یا لفظوں کے ذریعے بیان ہوتی ہے انہیں سے موضوع، مفہوم یا بنیادی خیال کا تعین ہو سکتا ہے۔

نئے شاعر نے زندگی پر منفی نقطہ نظر سے غور کرنے کے ساتھ ساتھ مثبت رویوں کو بھی گرفت میں لانا چاہا ہے۔ وہ مادی دنیا کے مروجہ خیالات اور اپنے تصورات میں موجود اشیا میں تعمیر و تخریب کے نئے سلاسل تلاش کرتا ہے۔ تجربہ اس کی ذات کا جزو بنتا ہے۔ وہ چیزوں کے لامتناہی سمندر میں کھو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنے عصر کے تیزی سے گزرتے لمحوں اور رواں دواں منظروں کی اصل حقیقت تک رسائی کی سر توڑ کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ وہ شدید جذباتی اور نفسیاتی کوائف کے روبرو اپنی اور خارجی معروضات کی شناخت کرتا ہے۔ اس کی شعری اقلیم میں صورتیں، حقیقتیں اور وارداتیں نشو و نما بھی پاتی ہیں اور بنجر بھی ہوتی رہتی ہیں۔ بقول افتخار جالب:

ادبی تخلیق اور جہانِ معنی کا رشتہ من و تُو کے تعارف کا رشتہ ہے۔ اس تعارف میں فنکار اپنی ذات کو مجتمع کرنے کے

ساتھ ساتھ اجتماعی سماجی زندگی کو جذباتی اظہار کے مناسب سانچے بھی مہیا کرتا ہے ۔لیکن ان عناصر کے متوازن اظہار کے مقتضیات ہر دور اپنے طور پر منتخب کرتا ہے ۔کبھی تو ان مقتضیات کو جرأت مندی سے قبول کر لیا جاتا ہے اور کبھی ، بلکہ بسا اوقات، ان کا بدل ماضی سے تلاش کر کے کام چلانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔چناچہ ابھی کل ہی کی بات ہے میر صاحب چند لوگوں کا اوڑھنا بچھونا تھے ۔وہ خلوص دل سے محسوس کرتے تھے کہ میر صاحب واقعتاً ان کی دُنیا میں درآئے ہیں۔یہ احساس کچھ اتنا دور از کار بھی نہیں تھا کہ ہر دو ادوار کے کچھ واقعات بظاہر مماثل تھے ۔پھر اقبال ،راشد،میرا جی اور ترقی پسند شعرا اظہار کے ممکنہ ذرائع اس حد تک بروئے کار لا چکے تھے کہ نو واردوں کو اپنا رنگ دکھانے کے لیے کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی ۔اس آڑے وقت میں میر صاحب کام آئے اور ان کا جہانِ معنی بے دریغ استعمال میں لایا گیا ۔بایں ہمہ میر صاحب جو اس مرحلے کو سُرخروئی سے طے کر گئے تو یہ ان کی عظمت کا ایک اور ثبوت ہے ،خیر، اگر رنگِ میر میں کچھ اچھی چیزیں منظرِ عام پر نہ آتیں تو افسوس ہوتا۔۳

لسانی تشکیلات کا نظریہ جہاں قدیم لسانی اور صرفی ونحوی اصولوں سے انقطاع کی ایک صورت ہے وہاں یہ نئے تجربوں کی استعاراتی تعمیر سے بھی گہرا ربط رکھتا ہے۔ نئے شاعر کے ہاں تازہ اور جدید تمثالوں کی فراوانی ہے۔نئی تمثال نگاری تجربے کی اکہری یا سطحی شکل سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں عام معاشرتی سطح سے لے کر کائناتی سطح تک تجربے کی لا تعداد جہتیں پوشیدہ ہیں۔ نیا شاعر تمثال کے ڈرامائی استعمال کو فوقیت دیتا ہے۔ وہ اختلال حواس اور تضاد سے تمثالوں کی تشکیل کرتا ہے۔ نئے شعرا کے ہاں بصری اور سماعی ہر دو نوع کی تمثالیں موجود ہیں۔ ان کے ہاں کہیں تمثال تحیر، آسیب اور خوف کی ترسیل کا ذریعہ ہے اور کہیں اس کے وسیلے سے اسرار، تنہائی، سناٹے ٹھہراؤ اور دہشت کی کیفیات بیان ہوتی ہیں۔نئی شاعری پر مختلف نقادوں نے مختلف اعتراضات کئے ہیں ۔ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ نئے شاعروں کو اردو شاعری کے مستقبل سے مطلق دلچسپی نہیں ہے

ظہیر کاشمیری نئے شاعر کو انارکسٹ اور زندگی کی ہر قدر سے مفرور سمجھتے رہے۔ اس ضمن میں مختلف نقادوں کے ہاں اس قسم کی آراء بھی ملتی ہیں کہ'' ان کے ہاں بے ساختگی نہیں ہے برجستگی معدوم ہے۔ نئے شاعر زبان ہی کے نہیں اس کے آزمودہ موضوعات کے بھی باغی ہیں اس لیے ناقابل برداشت ہیں، ان کی نظمیں شعریت کے بجائے تعقل کو فوقیت دیتی ہیں۔ نیا شاعر نیوراتی (neurotic) ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ محض اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے''۔

(بحوالہ ،اُردو کے ٹیڈی شاعر،مشمولہ ،نئی شاعری ،ص: ۱۹۹)

نئے شاعروں نے جواب میں کہا نئے شاعر کے نزدیک حقیقی شاعری کا مواد کسی میکانکی نظریے سے خواہ وہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو ،دریافت نہیں کیا جا سکتا ۔اس لئے اس کے لئے کسی ہیئت کی کوئی مشروط شکل نہیں۔ روایت سے بغاوت نئی شاعری کی اہم قدر ہے۔ نیا شاعر نئے ماحول میں رہتے ہوئے پرانے موضوعات کی جانب اس وقت تک نہیں پلٹ سکتا جب تک وہ اس کا جذباتی اور وارداتی مسئلہ نہیں بن پاتے۔ پرانی صورت حال نئے نفسِ ماحول کی بدولت نئے شاعروں کا جذباتی مسئلہ نہیں رہی۔ جہاں تک نئی شاعری میں تعقل کے عنصر کا تعلق ہے، یہ الزام اس لئے درست نہیں کہ نئے شاعر علامتی اظہار کو فوقیت دیتے ہیں اور علامتی اظہار میں تعقلاتی رشتوں کے بجائے اشیا کے جذباتی اور تصوراتی رشتوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ نئے شاعر کو نیوراتی امراض کا شکار کہا

گیا ہے۔ یہ خصوصیت تو پرانی شاعری میں بھی موجود تھی یعنی عشق مرض لا دوا کی صورت اختیار کر کے شاعر کو نیوراتی یا لیونیٹک بنا دیتا تھا۔ جہاں تک نیوراتی امراض کے ذاتی ہونے کا تعلق ہے نیوروسس میں صرف ذاتی عوامل ہی کارفرما نہیں ہوتے۔ آفاقی اور اجتماعی پہلو کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ نیا شاعر پرانے ماورائی اور معاشرتی رشتوں کا منکر ضرور ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ نئے روابط اور ماحول کی نئی ترکیب کے لئے بھی کوشاں رہتا ہے۔

افتخار جالب کی ایک مختصر نظم ملاحظہ کیجئے جس میں جنگل ذات کے الجھاؤ اور صداقت کی تلاش اور جستجو کی علامت بن جاتے ہیں۔

لوگو! میرے پاؤں زمین ڈھونڈتے ہیں
میں نے بہت مدتیں خواہش کی بجھارت میں گزار دی ہیں
کہاں جاؤں
جنگل میں کھڑا راستے کے پیر میں ہوں آبلہ پا
لاکھ کہوں میری زبان دانی تناقص کا شکار
آدمی کا آدمی سے نعمت مترقبہ
کب پہنچنے کا وقت پڑے
کوئی نہیں جانتا [۴]

افتخار جالب اپنے ایک مضمون میں اپنے لگائے ہوئے نئی شاعری کے پودے کی نشو و نما کا قصہ یوں سناتے ہیں:

پچھلے پچیس برس سے، کچھ یوں ہی افتاں و خیزاں گردشِ رنگ چمن سے درآویختہ تاریخ کے تیز رفتار ہوش رُبا زیروبم سے گزرتے ہوئے ہم ایک اسٹیپ ڈھلوان پر آ گئے ہیں۔ اجتماعیت کی تحریکیں دم توڑ چکی ہیں۔ انسانوں کی انتہائی غالب اکثریت کا پاورٹی لائن سے نیچے ہی نیچے چلے جانا گویا مقدر ہے۔۔۔امریکی گلوبلائزیشن کا مقابلہ کیسے ہو گا؟ ڈالر کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہے؟'' میں کہتا ہوں کہ ڈالر کی قیمت اور استحکام امریکیوں کے ہاتھ ہی میں نہیں، ورنہ اس کا ایکسچینج ریٹ اس سطح پر مستحکم کریں کہ ان کی اشیا سخت بین الاقوامی مقابلے کے باوجود کم قیمت پر بکیں۔ نہ امریکی اکانومی ریسیشن سے بچ سکتی ہے، نہ دُنیا زیادہ دیر تک یونی پولر رہ سکتی ہے۔ یہ دُنیا بائی پولر یا ٹرائی پولر ہوا ہی چاہتی ہے۔ پھر ہم نیشنل اسٹیٹ سطح پر اپنے فائدے کا یونائیٹڈ فرنٹ بنائیں گے۔ اگر نیشنل اسٹیٹ کا انسٹیٹیوشن دریابُرد ہو گیا تو کون سی ایسی تاریکی ہے جس میں سارترین انڈویجوئل کی روشنی نہ دمک سکے۔ پھر ہمارے نئے اجتماعی ادارے مثلاً ڈبلیو ٹی او کے خلاف مزاحمتی گروپ، ڈاکٹرز ود آؤٹ فرنٹیرز، آئی ایل او وجود میں آ چکے ہیں، سبحان اللہ! گلوبل کیپٹل ازم اور ایتھینسٹی کی ایسی کی تیسی! ایتھینسٹی اور گلوبلائزیشن زندہ / مردہ باد! اس سے ملتی جلتی صورت حال ۱۹۵۱ سے ۱۹۷۵ء تک کے لاہور میں موجود تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی اہم نوجوان شعراء پر مشتمل ایک فوج تیار ہو گئی۔ صفدر میر نے نئی نئی شاعری کے حوالے سے ایک مضمون لکھا۔ جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نئی نئی شاعری کیا بلا ہے؟ سب خرافات ہے! ظہیر کاشمیری، ممتاز حسین اور قتیل شفائی خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ نوائے وقت، امروز، مشرق، پاکستان ٹائمز اور ڈان میں کالموں اور مضامین کے انبار لگ گئے۔ مبارک احمد اور جیلانی

کامران بھی نئے شاعروں میں شامل ہو گئے۔محمد حسن عسکری نے سات رنگ شروع کیا۔ پہلے ہی پرچے میں نئے شاعروں کی صف میں کھلبلی مچ گئی۔ انتظار حسین کا مضمون ''پوچھتے ہیں وہ کہ مادھو کون ہے؟'' اُس زمانے کا یادگار مضمون ہے۔سلیم احمد اور احمد ہمدانی کی گولہ باری اس پر مستزاد تھی۔ انیس ناگی' جیلانی کامران اور افتخار جالب کو چومکھی لڑائی لڑنا پڑ رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ عارف امان اور عزیز الحق نے حلقہ ارباب ذوق میں ہفتے وار تحریری اور زبانی یلغار شروع کر دی۔اُس وقت حلقہ ارباب ذوق کو ایک آزاد براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی حیثیت حاصل تھی۔وہاں ترقی پسند' ادب پرست اورانسان دوست اپنے اپنے مکتبۂ فکر کے حوالے سے نئے شاعروں کو انتہائی غیر منطقی گفتگو سے زودکوب کرکے پاک ٹی ہاؤس میں آتے۔ پھر قیوم نظر' شہرت بخاری اورناصر کاظمی کی سرپرستی میں نئے شاعروں کی دوبارہ ٹھکائی کی جاتی۔ وائی ایم سی اے اور پاک ٹی ہاؤس کے اجلاسوں پر مبنی کارروائیوں کی رپورٹیں ہفتے بھر اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہتیں۔ اب نئی شاعری کا مقدمہ اور شدت اختیار کر گیا۔ پنڈی' سرگودھا اور ساہیوال کے شریف النفس ادیب کب تک صبر کرتے۔ ساہیوال کے سجاد میر نے نئی شاعری کی سیمنٹکس کو ہدف تنقید بنایا اور ان کے ذریعے شیر محمد اختر کی ادارت میں شائع ہونے والا قندیل بھی ایس یدھ میں شامل ہو گیا۔ انور سدید کی بے مثل زود نویسی کی بدولت سرگودھا اسکول کی اسکیننڈ لائزیشن نے بہت شہرت پائی۔ اُردو زبان سرگودھا نے عصمت علیگ کی قیادت میں نئے شاعروں کے ڈرٹی لنن کی بلودی بیلٹ تشہیر کے لیے چھوٹے چھوٹے مضامین اور پیروڈیوں کے ڈھیر لگا دیے۔عصمت کرونڈے علیگی سانپ نے بڑی مشکلات پیدا کیں۔ انیس ناگی کو تو ایک کتاب پھر سے لکھنا پڑ گئی۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اُن پیروڈیوں میں سے ایک آدھ اس کتاب کے فلیپ پر ضرور چھپوا دیتا۔اس میدان کارزار میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی انتھالوجی نئے نام اور رسالے شب خون کے ذریعے مبارزت طلبی کی۔ جیلانی کامران کی کتاب نئی نظم کے تقاضے افتخار جالب کا لسانی تشکیلات کا سلسلہ مضامین' انیس ناگی کی دو کتابیں شعری لسانیات اور نیا شعری اُفق سید سجاد کی مرتبہ انتھالوجی نئی نظمیں افتخار جالب کے مرتب کردہ مضامین کا مجموعہ نئی شاعری، سلیم احمد، اختر احسن، عارف امان، عزیز الحق، فہیم جوزی، سعادت سعید، تبسم کاشمیری، سہیل احمد خان، آزاد کوثری، اور امجد اسلام امجد کے مضامین اور کتابیں اسی دور کی جدلیاتی صورت حال سے جہت لیتی ہیں۔ ابھی نئی شاعری کی کنسالیڈیشن ہو ہی رہی تھی کہ قمر جمیل نے کراچی سے نثری نظم کا دھماکا بولا۔ ہفت روزہ نصرت لاہور نے اس تحریک پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا اور اس میں کراچی گروپ کے ساتھ ساتھ ملک بھر کے نثری نظم لکھنے والوں کو ایسی پذیرائی دی کہ یہ ایک جان دار تحریک بن گی۔جس کا ہراول دستہ تو احمد ہمیش' قمر جمیل' محمد سلیم الرحمٰن اور عباس اطہر ہی پر مشتمل تھا۔لیکن آخر کو اس میں راشد بھی شامل ہو کر لندن جا بسے۔ اور ہم ہیں کہ ۱۹۷۶ء سے کراچی ہی میں ہیں۔ ہر میگا سٹی جغرافیائی طور پر جہاں بھی ہو' وہیں ہوتا ہے' لیکن اس کے تہذیبی اور ہائی فنانشل آفاق ایک آئیڈیالوجیکل مائتھالوجم سے مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ گلوبلائزڈ بھی ہوتے ہیں۔

(ہمارے گلوبلائزڈ پچھواڑے میں بوگن ویلیا کی پھولوں بھری بیلیں) ۵

۲ افتخار جالب نے اپنے شعری مجموعے ماخذ کے تیسرے حصے کا آغاز یوں کیا ہے:

The imperfect is our paradise.
Note that, in this bitterness, delight,
Since the imperfect is so hot in us,
Lies in flawed sords ands stubborn sounds.۶
Wallace Stevens

نئے شاعروں میں افتخار جالب کی نظمیں بظاہر مشکل، گنجلک اور مفہوم سے معرا نظر آتی ہیں ان کی نظموں میں موضوع کے تلازمات اور روابط کی دریافت کا طریق کار اس عہد تک کی جدید نظم کی روایت سے بالکل مختلف ہے۔ خیال اور ادراک لاتعداد جہتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ افتخار جالب کی نظموں میں موضوع محدود نہیں ہے اور یہ کوئی مرکزی نقطہ بھی نہیں رکھتا۔ ہم بکھری بکھری تصویروں، منتشر خیالات اور ریزوں میں منقسم احساسات کے سیاق و سباق میں اس معنوی اکائی کو دریافت کر سکتے ہیں جو کسی پیچیدہ تجربے کو تنظیم و ترتیب اور مرکزی جہت عطا کرتی ہے۔

افتخار جالب کی نظموں کے طریق کار پر رائے دیتے ہوئے سید سجاد رقمطراز ہیں کہ

> شاعر کا میتھڈ بہت اہم ہے کہیں بھی صرف علامت، تلازمے اور تجرید پر انحصار نہیں کیا گیا۔ ان سب چیزوں کو کہیں تو اکٹھا اور کہیں زور بازو کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ نظم ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور ایک فکری تسلسل کے ساتھ چلتی ہے اور پھر دو تین مصرعوں میں ہی تلازمہ نئی دنیاؤں اور تصویروں میں لے جاتا ہے۔ اس تلازمے میں تصویریں محض تصویریں نہیں رہتیں۔ علامتیں بھی بنتی ہیں۔ پھر یہی علامتیں علامتوں سے ابھر کر تجریدی عمل میں مصروف نظر آتی ہیں۔ تجریدی عمل دوبارہ اس مقام پر لے آتا ہے۔ حتی کہ نظم کے بنیادی خیال کی ہر ذہنی سطح سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ ۷

افتخار جالب کی نظمیں نئے عہد کے انسانی مسائل کی پیچیدگیوں کو بڑے موثر طریقے سے بے نقاب کرتی ہیں۔ حال کے لمحوں کی اذیت، کرب اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے فرد کی انتشاری شخصیت کے کوائف ان کے ہاں عمومی ہیں۔ افتخار جالب کے لئے ماضی اور ماضی سے متعلق تمام روایات اپنا مفہوم کھو بیٹھتی ہیں۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت، اپنے اخلاقی تصورات اور اپنے فکری مفروضوں کو حال کے لمحوں کی تبدیل شدہ صورت حال سے اخذ کرتے ہیں۔ افتخار جالب کی نظموں میں فرد سے اجتماع کی طرف بڑھنے کے رجحان کو عبدالحق کھامی ذیل کے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

> افتخار جالب کے نزدیک انسانی تاریخ کا ہر واقعہ جس میں دیو مالا، ادب، کلچر، علوم اور سائنس شامل ہیں ہر دور میں نئے معانی لے کر آتا ہے۔ جن کی دریافت کا منصوبہ وہ زبان کی مینیپولیشن (manipulation) سے تیار کرتا ہے چاہے اسے اپنے اس سلسلہ میں کتنا ہی طویل سفر کیوں نہ کرنا پڑے چنانچہ وہ الفاظ کے باہمی رشتے سے اشیا اور ان کی ترتیب کے درمیان ایک اندرونی رشتہ دریافت کرتا ہے اور اسے انسانی ذہن کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے اس کی شاعری میں جب مختلف علوم اکائی کی شکل اختیار کرتے ہیں تو تمام دنیا سمٹ جاتی ہے اور انسان ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں یوں افتخار جالب اجتماعیت کا گیت گاتا نظر آتا ہے۔ ۸

افتخار جالب معاشرتی رشتوں کی موجودہ صورت حال سے، جس میں اجنبیت بعد، نفرت، دشمنی، لوٹ مار کی قدریں شب خون مارتی ہیں قطعاً مطمئن نہیں ہیں۔ وہ قدیم معاشرے کے اسباب و علل کے رشتوں کو قبولیت کا شرف دیتے ہوئے نئے عہد میں جنم لیتے واقعات و حادثات کی نت نئی متغیر شکلوں میں ایک نئی ترتیب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ افتخار جالب کی نظمیں پروٹسٹ اور کشمکش کے تخلیقی عناصر سے قوت حاصل کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں یکسانیت اور موزونیت کی بجائے رنگا رنگ، متنوع اور غیر متوازن طرز

احساس کی جھلک ہے۔ ان کے ارد گرد کے ماحول میں کالی سڑکوں پر بکھری زہریلی آنکھیں ہیں۔ ٹریفک کا ہنگامہ ہے۔ اقتصاد و معاش کی کشمکش ہے۔ مہنگا اناج ہے، کھیتوں میں غلہ بان مر چکے ہیں۔ گاؤں کی گوری کے پاؤں دھندلا چکے ہیں۔ خوف و اذیت کا ثمر چکھا جا رہا ہے۔ دل عفونت سے سزا یافتہ بوچڑ کی دکان بنا ہے۔ آدمی کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ ہستی کی شیرازہ بندی ٹوٹ گئی ہے۔ احساس میں لامحدود لق و دق صحرا کا سا انداز ہے۔ زمانے کی آنکھیں عنصیلی ہیں۔ آدمی کی شبیہیں پگھل رہی ہیں اور پرہول، سحر آفرین شکلوں میں ڈھلتی جا رہی ہیں۔ قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے پوری کی پوری آبادی دفن ہے۔ کفر و الحاد کے عناصر فروغ پا رہے ہیں۔ ان کی نظموں کا مرکزی کردار تضادات کی تاویل میں گھلتا ہے۔ وہ کٹھن دنوں کی مشکلات اور مٹی میں فنا ہوتی کیفیتوں میں گھرا ہوا ہے۔ دنوں کی قید اس کا مقدر ہے۔ اپنی عظمت کے قصے گاتا ہے تو کھوکھلا دکھائی دیتا ہے۔ وہ خواہش کی بجھارتوں میں گم ہے۔ اس کے خوابوں کے کوچے میں شب تار کا عالم ہے۔ وہ اپنے آپ کو جنگل میں ایستادہ محسوس کرتا ہے۔ اسے راستے کی تلاش ہے۔ انسان اپنے آپ سے دور ہو چکا ہے۔ اپنی شناخت اور اپنی پہچان کے لیے بے حد ضروری کہ شاعرنئ صورت حال میں الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس الجھاؤ میں حقیقتیں ریزوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ سچائیاں توڑ پھوڑ کی زد میں آتی ہیں۔ تعقلات میں انتشار کی تصویریں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان حالات میں زبان میں شکست و ریخت لازمی ہے۔

افتخار جالب نے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لسانی تشکیلات کا سہارا لیا ہے۔ ان کے لئے بدلتی ہوئی صورت حال کا مسئلہ شاعری کے حوالے سے زبان کا مسئلہ بن گیا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں زبان کے پرانے قواعد سے انحراف کرتے ہوئے بات کہنے کے غیر مربوط انداز کو اپناتے ہیں۔ ان کے ہاں ولیم فاکنر کی تحریروں کی طرح طولانی جملے کا افتاں خیزاں بہاؤ مع اہم اور غیر اہم جزئیات کے موجود ہے۔ افتخار جالب نے ولیم فاکنر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ معنی کو ظاہر ہونے سے ارادتاً روکنے اور تدریجی تاخیر آمیز جزوی افشا کے لئے مختلف قسم کی دشواریاں اس لئے پیدا کرتا ہے کہ ہیئت اور خیال عین تحرک کے عالم میں نامکمل، سیال اور نا معلوم رہے تا وقتیکہ آخری لفظ ادا نہ ہو جائے۔

افتخار جالب کی نظموں میں تجربے کی نوعیت بہت حد تک سورئیلی فنکاروں کے تجربے سے مماثل ہے۔ ان کے ہاں اشیا کی پہچان کا ریاضیاتی طریقہ بے معنی ہے۔ جدید مصوری میں بھی اشیا کی شناخت کے لیے دو اور دو چار کا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا، انسانی کردار کی تہہ در تہہ پرتوں سے پردہ اٹھانے کا کام جدید نفسیات کے ساتھ ساتھ جدید شاعری نے بھی پایہ تکمیل تک پہنچانے کا التزام کیا ہے۔ افتخار جالب کی نظموں میں نفسیات، فلسفہ یا منطق کے بعض معاملات ان کے ذاتی میلانات و رجحانات، مشاہدات و تجزیات میں شامل ہو کر نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے انسان کی صورت حال پر مختلف النوع زاویوں اور جہتوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی، فکری، جذباتی، علمی اور تحلیلی انداز نظر ان کے ہاں کچھ اس طور سے ابھرتا ہے کہ وہ فلسفہ تاریخ یا منطق کی کہانی معلوم ہونے کی بجائے وارداتی، احساساتی اور جذباتی پیرایہ اظہار کی بدولت شعری تصورات کی کامیاب تشکیل کا قائمقام بن جاتا ہے۔

ہوا آئے گی

بحر نیلگوں کے سرد سینے پر شکستہ رنگ ذروں کو قیامت تک لیے پھرتی رہے گی اور ظلمت کی بھری آغوش میں آخر ظہور

آدم خا کی مجھے تنہائی بخشے گا

میں حیران کوچہ جانان کی رعنائی کو دیکھوں گا۔ بدن بے حرکتی میں منجمد اندھے تصور کی دلآویزی کی حد سے ماورا، وصل دو عالم میں بسا احساس کی شرمندگی کی دھوپ میں، محبوب کے شیریں، عدم رفتہ، انجانے تن کو چھو کو کھول جائے گا، جسے زندان ہستی میں تلاش وجستجو کے بعد وہم وگمان پایاں، بالآخر خیمہ شب میں اسی کی ذات سے شیر وشکر ہونے کی لذت حشر تک مصروف رکھے گی۔ [۹]

افتخار جالب کی نظموں میں موضوع اور مواد کے تنوع کے ساتھ ساتھ زبان کا نیا استعمال اہم ہے۔ ان کی زبان سائنسی اصطلاحات کی طرح مجرد، مستقل اور ثباتی نہیں ہے۔ وہ چونکہ کسی فلسفے یا نظریے کا پرچار نہیں کر رہے تھے اسلیے زبان میں احساس اور جذبے کے تناقض، تضاد، ابہام اور اہمال کا ہونا قابل گرفت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب خصوصیات شعری تجربے کے لئے لازمی ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں شاعری سائنس اور منطق کا نام بنتی ہے۔ وہ بیان کو نئے سرے سے تشکیل دینے کے جرأت مندانہ عمل سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ ان کی نظموں میں الفاظ کا جوڑ توڑ عمومی ہے۔ وہ ان سے نئے معانی پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کے لفظوں کے استعمال کی حیثیت کو ان کی نظم کے مجموعی معنوی سانچوں سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

افتخار جالب کی نظموں میں لفظوں کی علامتی توانائی اور معانی کا ایک نیا سلسلہ دریافت ہوتا ہے۔ اربن نے اپنی کتاب لینگویج اینڈ ریالٹی (Language and Reality by Wilbur Marshall Urban; 1939) میں اسی اثباتیت (Nominalistic Positivism) کے اس نظریہ زبان کی شدید مخالفت کی ہے جس کے تحت زبان کے اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جذباتی اور تحلیلی یا سائنسی۔ اربن کا عقیدہ ہے زبان کا ایک اور بھی عمل ہوتا ہے جسے وہ احضاری، (ریپریزینٹیشنیل ، Representational) وجدانی یا علامتی کہتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کے بغیر زبان میں معانی پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ شاعری کو محض جذباتی نہیں کہتا عرفانی یا حقیقت کو شعور بخشنے والی چیز بھی سمجھتا ہے۔ یہ کام شاعری میں استعاروں اور علامتوں کی مدد سے ہوتا ہے۔

سید سجاد نے افتخار جالب کی نظموں میں لسانی تشکیلات کے عمل پر معاشرتی وسماجی نقطہ نظر سے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

افتخار جالب کا سارا شعری تجربہ وزن اور ردعمل ذاتی سطح پر نہیں۔ اس لیے اس میں جذبات کی ظاہری شدت کا فقدان ہے۔ جب بھی کوئی فنی شکل تجربے کو ذاتی سطح سے آفاقی سطح پر لے جاتی ہے تو اس میں ذاتی محسوسات اور جذبات کا عمل خوابیدہ اور زیر سطح ہو جاتا ہے اور کلاسیکی رکاؤ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ موجودہ شاعر کی حیثیت سے افتخار جالب کا یہ نظریہ شعر اتنا قابل قبول نہیں کہ لسانی تشکیلات از خود ایک حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ اس امر کو ماننے سے شاعری ایک سماجی فعل کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہے۔ شاعر جو ایک فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی ذات اور انسانی واقعہ کو سمجھ کر کومٹمنٹ (commitment) کرنے کا ذمہ دار ہے اس نظریہ شعر کی بدولت اس فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اگر شاعر صرف لسانی تشکیلات اور فنی اشکال کی تشکیل کا ذمہ دار ہے تو وہ آج کی دنیا میں کس حیثیت سے رہ رہا ہے اور اس کا کیا مقام ہے۔ شاید شاعر کو یہ صورت حال قبول نہ ہو، اس نقطہ نظر سے افتخار

جالب شاید مستقبل کے نمائندہ شاعر تو ضرور بن جائیں گے لیکن موجود دور کی نمائندگی میں ان کی وہ حیثیت نہ ہو گی جو ہونی چاہئے۔ [۱۰]

سید سجاد نے ان کے لسانی تشکیلات کے نظریے کو پورے طور پر نہیں سمجھا۔ اس نظریے کے تحت شاعر نہ تو معاشرتی صورت حال سے اپنا رشتہ منقطع کرتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاں سماجی عمل سے گریز ہوتا ہے۔ یہ تو ایک طریق کار ہے کسی کیفیت یا موضوع کو اس کی جزئیات سمیت گرفت میں لانے کا ۔ یہ کیفیت شدید قسم کے ذاتی ردعمل سے جنم لیتی ہے۔ معاشرے اور فرد کے ٹکراؤ اور تصادم سے تقویت حاصل کرتی ہے۔ لسانی تشکیلات کی حیثیت بطور طریق کار کے ہے۔ اس طریقہ کی ضرورت نئی پیچیدہ صورت حال سے پیدا ہوئی ہے ۔ لسانی تشکیلات میں زبان کے تحویلی یا سائنسی استعمال کی بجائے وجدانی اور علامتی استعمال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں جذبے اور فکر کی ایک دوسرے میں مدغم اور پیوست صورتوں کی فراوانی ہوتی ہے ، جذبہ اور فکر جو نئے دور کے انسانی ذہن کی پیچیدگیوں اور ابہام کی تہہ در تہہ پرتوں کی بدولت میں الجھے ہوئے اور پیچیدہ ہیں۔

انیس ناگی کا کہنا ہے کہ:

> افتخار جالب ماضی کے جذباتی رویے کی بجائے حال کے عقلی رویے سے حقیقت کا تصور وضع کرنا چاہتا ہے۔ تجزیہ اور تجرید اس کے ذہن کو اشیا اور موجودات کی صداقتوں پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ تقدیر کے اچانک در آنے والے مخفی واقعات کا ادراک بھی کرنا چاہتا ہے۔ افتخار جالب کی نظموں میں فکری خود اعتمادی کا اسلوب بڑا نمایاں ہے۔ اس کو یقین ہے کہ وہ زندگی کے جن نئے ماخذ کی تلاش میں ہے وہ عہد حاضر کے اسلوب زیست کے حقیقی ترجمان ہیں ۔ [۱۱]

افتخار جالب کی نظموں میں تشکیک، انتشار، تنہائی ،دہشت ،جرم، تشدد، محبت ،نفرت، اذیت اور لذت کے رویوں کی بہتات ہے۔ انہیں ہر شے دھندلی نظر آتی ہے۔ نازک اور سیاہ خاموشی میں لپٹی دکھائی دیتی ہے۔ وہ جستجو اور تلاش کے عمل میں کالی سڑکوں پر روشن ستاروں کی زہریلی آنکھوں میں جکڑے جاتے ہیں۔ زمیں خونچکاں نظر پڑتی ہے۔ بینائی سے محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ازل سے ابدتک تنہائی کی دھند پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ افتخار جالب کبھی انسان کو بے کراں اور بے زماں دیکھتے ہیں اور کبھی ظلمتوں کا اسیر۔ وہ اپنے آپ کو جنگل میں گھرے راستے کے پھیر میں پاتے ہیں اور اپنے دل کو عفونت سے پُر بوچڑ کی دکان کہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں دھوپ سائے پھونکتی ہے اور دیواریں تنہائی کی شکل پیش کرتی ہیں۔ احساس گناہ قلب و جان پر طاری ہو جاتا ہے۔ دل کی بے چارگی اور زبان کی مجبوری کے باوجود اپنے ہونے کا یقین ہے۔ ان تمام اثرات کے تحت وہ اپنی نظموں میں شعری اسلوب کی تمام روایتی نزاکتوں اور ترتیبوں کو بدل دیتے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کے باہمی رشتے تخیلاتی اور تلازماتی ہیں۔ کہیں کہیں خطابت کا انداز بھی ابھرا ہے۔ افتخار جالب نے عربی اور فارسی سے لسانی مرکبات بنائے ہیں۔ وہ مفرد کے بجائے مرکب الفاظ استعمال کرنے کے شائق ہیں۔ افتخار جالب کی نظموں کی ہیئت اپنے معاصر شعرا سے مختلف اور معنی خیز ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مصرعوں سے نظم کا آغاز کرتے ہیں اور خیال کے تدریجی ارتقا اور پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ان مصرعوں میں طوالت آتی جاتی ہے۔ یہ مصرعے ایک دوسرے میں ضم ہو کر بندوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں علامتی وحدت کا نمونہ ہیں۔ وہ کسی ایک علامت

پر اپنے خیال کی بنیاد نہیں رکھتے بلکہ علامت در علامت اپنے خیال، جذبے اور کیفیت کو سموتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی نظموں کی وضاحت اور تشریح میں مشکل بھی پیش آتی ہے۔

افتخار جالب دور جدید کے سب سے زیادہ متنازع شاعر اور نقاد ہیں۔ ان کی شاعری اور تنقید پر چوطرفہ حملے کیے گئے ہیں۔ روایت پرستوں نے انہیں ابہام زدہ، بے معنویت پر مبنی ہیئتی تجربوں کا علمبر دار اور شاعرانہ معیارات کا دشمن قرار دیا۔ جدیدیت پرستوں نے ان کے بوجھل اور غیر جمالیاتی طرز بیان کو ہدف تنقید بنایا۔ ترقی پسندوں نے عوام دشمن خواص پسند شاعر کا خطاب دیتے ہوئے انہیں سامراجی ثقافت کا مقلد جانا۔ نئے نقادوں نے ان کی نظریاتی جستوں پر حرف زنی کی۔ یوں افتخار جالب کار زار ادب میں تنہا اپنا دفاع کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور تنقید کے چراغ آج بھی دنیائے ادب کی تاریکیوں کو منور کرتے نظر آتے ہیں۔ افتخار جالب کی شاعری میں ابہام تلاشنے والے شعور کی درجہ بندیوں کو فراموش کر گئے۔ بے معنویت پر مبنی ہیئتی تجربوں کی آواز لگانے والے نقاد جدید ترین ادب کے نئے معیارات سے واقف نہ تھے۔ شاعرانہ معیارات کی دشمنی افتخار جالب کے لئے قابل فخر ہے کہ جن معیارات کی انہوں نے بیخ کنی کی ہے وہ روایتی اور گھسے پٹے شاعرانہ معیارات تھے۔

افتخار جالب نے نئی اردو شاعری کو جدید ترین شاعری کے جدید ترین معیارات تفویض کیے ہیں۔ اس کا بوجھل اور غیر جمالیاتی اسلوب اپنے اندر جو فکری و احساساتی عمق رکھتا ہے اور حسن کے جن نئے زاویوں کا عکاس ہے جدیدیت پرستوں نے ان کی تحقیق پر توجہ نہیں دی۔ ترقی پسندوں کے فارمولہ ادب پر اگر فنی تخلیق پوری نہیں اترتی تو وہ عوام دشمن خواص پسند اور سامراجی ثقافت آشنا ہی رہتی ہے کہ ہمارے ترقی پسندوں نے زندگی کے خار زاروں کو محض کتابی آنکھ سے دیکھنے کا نائک کھیلا ہے۔ جہاں تک افتخار جالب کی نظریاتی جستوں کا تعلق ہے تو باشعور قارئین کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ انہوں نے اپنے ہر دور اور ہر زمانے میں بنی بنائی اور ڈھلی ڈھلائی روائتوں کے بت پاش پاش کیے ہیں خواہ وہ ان کی اپنی بنائی ہوئی روائتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس روایت شکنی کے عمل میں انہوں نے اپنے لئے ارتقائی نظریات کو منتخب کیا ہے رجعتی نظریات کو نہیں۔

افتخار جالب اس پس منظر میں حقیقی ترقی پسندانہ شعور کے شارح نظر آتے ہیں۔ ان کی مکمل توجہ کا مرکز لسانیات ہی پر استوار ہے۔ لفظ ہمارے آؤٹ لک اور ہمارے (ویلٹنشانگ) کی امانتیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ لسانیات کا معاملہ محض لغاتی مونتاگ فیوں کا معاملہ ہوتا تو شاید افتخار جالب کو اتنا کشٹ اٹھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ شعر و ادب میں الفاظ اور ان کی تشکیل کا عمل فی الاصل انسانی وجود اور اس کی نظریاتی مسافرت کی آئینہ بندی کا عمل ہے۔ افتخار جالب نے لسانی شکست و ریخت کو محض اور محض فنی معاملت کے لئے استعمال نہیں کیا، اس کے وسیلے سے اپنے وجود انسانی ہستی اور سماجی اتار چڑھاؤ کے معانی دریافت کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ افتخار جالب کی شاعری تہہ داریوں کی شاعری ہے۔ ان تہہ داریوں کا خاصہ یہ ہے کہ یہ غیر متعینہ تہہ داریاں ہیں۔ ان کی تھاہ پانے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تخلیقی جہتوں کے حامل نقاد ان کی نظموں میں بنے گئے معنویت کے الجھے ہوئے جال کو سلجھا سکتے ہیں۔ افتخار جالب نے اپنے شعور کے وسیلے سے اپنی ذات کو ہمیشہ میدان مجادلہ میں رکھا ہے وہ اپنے آپ کو بناتے بھی رہے ہیں اور اپنے ساختہ اپنے آپ کو بگاڑتے بھی رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں تاریخی، اساطیری، سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی پیچ وخم ایک عجیب ابتری کو جنم دیتے ہیں۔ اس ابتری کے بطن کی کلی تفتیش محنت چاہتی ہے۔ وہ دو اور دو چار کی ریاضیاتی اور موضوعاتی شاعری کے

خالق نہیں ہیں۔ ان کے الفاظ امکانات رکھتے ہیں۔ معانی پھیلاؤ اور وسعتوں سے ہمکنار ہیں۔ مصرعہ سازی کے نئے نئے تجربات ہیں جن کے مطالعے سے بسا اوقات تو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ انہوں نے جدید ناول، جدید افسانہ اور جدید ڈرامہ کی بہت سی تکنیکیں استعمال کی ہیں۔

ماخذ افتخار جالب کی اولین شعری تخلیق ہے۔ یہ نظمیں اردو شاعری کی تاریخ میں وسیع وعریض منظرنامے کی بے مثال اور نادر نظمیں ہیں۔ خیال، فکر اور شعور کے ہمہ جہتی پھیلاؤ کا مظہر ہیں۔ افتخار جالب نے انسان کی جذباتی وفکری کائنات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ ماخذ کی نظمیں یک سطحی تجربات کی نظمیں نہیں ہیں۔ ان کا خالق آئینوں میں مناظر دیکھنے کا قائل نہیں ہے۔ تماشائی یا کیمرے کی آنکھ افتخار جالب کے مشاہدے کا وسیلہ نہیں۔ کلی طور پر لاتعلقی یا کمرے میں بند ہو کر تصور تراشی ان کی تخلیقی اخلاقیات میں جائز نہیں ہے۔ صورت حال میں شامل رہ کر قریبی زاویوں سے انہوں نے انسانی زندگی اور تاریخ کے حقائق کا سراغ لگایا ہے۔ عشق ومحبت کے نازک معاملے ہوں، انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوں، انسان پر انسان کے مظالم کے روز ناچے ہوں، کائنات کی ابتدا اور انتہا کے فلسفیانہ استفسارات ہوں۔ اپنے گمشدہ وجود کی تلاش کا عمل ہو، تاریخ اور ماضی کی از سر نو تشریح و دریافت کا کشٹ ہو، انسانی فطرت کے اساطیری مظاہر کی روداد ہو، صنعتی تہذیب میں فرد کی ایلیے نیشن اور مکروہ انفرادیت پسندی ہو، وحدت الوجود کی کی صوفیانہ جہت ہو کہ انسانی ہستی کے وجودی انتخاب اور اذیت کی صورت حال، افتخار جالب نے اپنے شعور اور تصورات کی وسعتوں سمیت ہر صورت حال میں مبتلا اسے نئی سمت، نیا آہنگ اور نیا لہجہ دینے کی تمنا سے معمور مسافرت کی منزلیں طے کی ہیں۔ ان کے لئے انسان اور انسانی رشتوں کی کائنات مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔

افتخار جالب نے جس سماج میں آنکھ کھولی اس میں سڑکوں پر زہر بھرے لوگوں کی دہشت ہے۔ کھیت میں گلہ بان کی موت واقع ہو چکی ہے۔ گاؤں میں گوری کے پاؤں تک دھندلا چکے ہیں۔ چیزوں میں کچھ روپ نہیں ہے، بیزاری ہے۔ روشنی گدائی کے مراحل سے گزری ہی نہیں، ماہ شب چار دھم تک کیسے پہنچے۔ دل کی گہرائیوں میں کھو کر انسان اپنے وجود کو صدا دینے لگا ہے۔ اناج بہت مہنگا ہے۔ انسانوں نے خاشاک کے ملبوس پہنے ہیں۔ بھوک سے مغلوب ہیں۔ در و بام کی تجارت روز افزوں ہے۔ دل عفونت سے سزایافتہ بوچڑ کی دوکان ہے۔ عدم کا لامتناہی سمندر ہر سو موجزن ہے۔ یادوں کے پر اسرار حسین مدفن میں حسرتیں ہی حسرتیں ہیں۔ روحیں ملفوف ہیں۔ پیار اور محبت عذاب سے کم نہیں۔ تنہائیوں کا طویل سلسلہ ہے۔ اداسیاں اور ندامتیں ہیں۔ بے چارگی ہی بے چارگی ہے۔ ثواب وگنہ کا مجادلہ ہے۔ اومنی بسیں، تجارتی مراکز، بجلی کے ٹیوبوں کے کرشمے! صنعت کی ترقی سے آنے والی خوشحالی کی حقیقت! انسان انسان سے جدا ہو چکا ہے۔ وقت کے میدان میں کھوٹا کھرا پرکھنے کا مرحلہ ہنوز دور ہے۔ دریچے بند ہیں۔ دروازے پر سرنگوں خامشی ہے، دل ہراساں ہیں۔ کھیت بنجر ہیں۔ ان میں کہیں پوہلی ہے کہیں کانٹے، سخت سردی ہے۔ ہاتھ شل ہیں۔ ہل جوڑنے سے جان جاتی ہے۔ گندم بونے ہی سے پیٹ پوجا ہوسکتی ہے، مجبوری ہے۔ ہر سو لامحدود ولق و دق صحرا کی ویرانی کی کیفیات بھی نظر آسکتی ہیں۔ گدھ روحوں کے صدف پھوڑ کے پتھر کا لہو پینے پر آمادہ ہیں۔ اندھے حوادث ہیں۔ سروں میں سودا ہے۔ نئی بشارت کے مرحلے بھی ہیں۔ زمین کی شاداب دھڑکنوں سے اعلائے کلمتہ الحق بھی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ کھنڈر ہیں، گھٹی ہوئی کال کوٹھری میں مکڑی کا نرم جالا تڑپ رہا ہے۔ سفید تاروں میں کالے تاروں سے تھرتھری ہے۔ گھروں میں خوشی نہیں ہے۔ کچھ خانوں کا راستہ روند مار کر کسی نے روک رکھا ہے۔ انسان اپنے دشمنوں سے اگلے پچھلے تمام قضیے چکا دینے کے موڈ میں بھی ہے، گلیوں اور بازاروں کی شکلیں اجنبی

ہیں۔ مفرور قیدی سزا سے ڈرتے ہیں۔ سوچیں مفلوج ہیں۔ صحراؤں نے دل دریا سمندر چوس لیے ہیں۔ کان حقیقت کی آواز سننے سے محروم ہیں۔ تغیر تبدل کی موجیں لپکتی نظر آتی ہیں۔ انسان کی ہستی کے تاریک خوابوں میں دیوانگی، شعلے اور پھیلاؤ کا منظر دیدنی ہے ۔تشکیک و تقدیر کی سرزمین سے سابقہ ہے۔ جہنم ہواؤں کے دامن سے لپٹی ہے اور گلی کوچوں، صحنوں اور دریچوں میں بہہ رہی ہے۔ ساحل ہست وحقیقت پر طوفانی موجوں کی یلغار ہے۔ انسانی ہستی کی رسی کا اپنے آپ سے برہم اور اپنے آپ سے لپٹا بل ہے۔ تعلقات کی سبھی سطحیں گم ہوچکی ہیں۔ عہد حاضر کی تلمیح تلذذ و تشدد زدہ ہے۔ باطن کی اساطیر تغیر کی ہواؤں کو جنم دے رہی ہیں۔ آفات کے سو ہاتھ ہیں۔ بازار میں سرخی کے نئے نئے برینڈ دستیاب ہیں۔ دل میں دبی رت سے گلستان بسانے کی آرزوئیں ہیں۔ فرد کے اعمال پر زمانوں کی گرد ہے۔ وحدت قلب و جاں سے شناسائی سے، گریز ہورہا ہے۔ گل گھوٹو جذبوں سے جینا اجیرن ہے۔ وقت اشد شدید مشوش خاطری کا مظہر ہے۔ افتخار جالب اپنی ہستی کو سماج سے انقطاع کے عالم میں نہیں دیکھتے تھے۔

افتخار جالب کی نظموں میں فرد یا ''میں'' کا روپ استعاراتی توسیع کا روپ ہے۔ فرد کی انفرادی کلیت اجتماعی کلیت سے منسلک ہے۔ مـــاخـذ کی نظموں میں انسانی رشتوں کی جو اسطور مرتب ہوئی ہے وہ فرد کی کلیت اور پھر اس کلیت کی اجتماعی کلیت کی اسطور ہے۔ فرد یا انسان کی کلیت کی لسانی تربیت وتشکیل شعری عمل کا اصل اصول ہے ۔افتخار جالب نے شاعری اور جدید فلسفے کی اس مشترکہ بنیاد پر اپنے شعری شعور کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جدلیاتی شعور کو سمیٹا ہے۔ جدلیاتی شعور زندگی او رسماج کو منجمد نہیں جانتا۔ ماخذ کا دیباچہ اپنے بطن میں جدلیاتی شعور کی نظریاتی جہت رکھتا ہے۔ جن شاعروں نے انسانی رشتوں کی کائنات سے آنکھیں دو چار کیں اور صورت حال کو اپنی دھڑکنوں کا حصہ بننے دیا۔ جدلیاتی شعور حاصل کیا اور مـتـخـیـلـہ کے بے لگام رخش کو ارتقا کے راستوں کی پہچان کروائی وہ عہد ساز اور نظریہ ساز شاعر ہوئے۔ افتخار جالب کا ویژن تخلیقی ٹھوسیت کا ویژن ہے۔ انہوں نے نہ صرف اظہار کی کائنات میں اپنا عہد پیدا کیا ہے بلکہ اپنے معاصر کئی اور شعرا کو اپنے اپنے عہد کی تشکیل کا ادراک بھی عطا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> درمیانے طبقے کے بیشتر ادیبوں کو بخوبی معلوم ہے کہ وہ کون کون سی برائیاں ہیں جن کا ابطال لازمی ہے۔ ایک حرف میں یہ بورژوا اسٹیٹس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔ چنانچہ اگر ادب ادیب کا قول وفعل ہے اور ادیب اور ادب میں کوئی تضاد نہیں تو یہ فعل بطور خاص ان غلطیوں سے اجتناب کرے گا جن کا شکار ترقی پسند ادیب ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس زمانے کے ترقی پسندوں کے مخالف راہ راست پر تھے۔ غور سے دیکھئے تو اس زمانے کے بیشتر ادیبوں کے لئے ادب زندگی کا اہم ترین مسئلہ تھا ہی نہیں۔ ان کی گھریلو زندگیوں کا آج کا نقشہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ادب کا ڈھونگ رچاتے تھے۔ کسی دوراہے پر کھڑے انتخاب کی اذیت میں مبتلا نہ تھے۔[۱۲]

انفرادی آزادی کی کلیت ہو کہ قومی خود مختاری کا مسئلہ، کشمیر اور فلسطین کی محرومیاں ہوں کہ دنیا کی دیگر مظلوم اقوام کے مسائل، جاگیرداری سماج کے محبس ہوں یا سرمایہ داری نظام کے زر کے ساختہ پنجرے۔ سامراجی نفسیات، تہذیبی معیارات اور سیاسی چالبازیاں ہوں کہ نو آبادیاتی علاقوں کی مجبوریاں اور محکومیاں، افتخار جالب کے لئے یہ علیٰحدہ علیٰحدہ خانوں میں بٹے ہوئے معاملات نہیں ایک ہی کلیت کا حصہ ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ سارے معاملے جذبۂ بے اختیار کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اسی حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ افتخار جالب کی شاعری کا بنیادی کردار انسانی کشمکش کی اذیت ناک صورت حال سے دو چار آزادی کے انتخاب کا داعی ہے۔ افتخار جالب اور لسانی تشکیلات کا نظریہ ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔ لسانی تشکیلات تاریخ، زندگی اور سماج سے متعلق ہمارے ادب میں کلیتہً نیا نظریہ ہے۔ افتخار جالب کے بقول مواد کا لسانی تشکیلات کی ہیت میں تجزیہ کرنے سے رائج الوقت شعری معیارات سے نجات مل جاتی ہے۔ پرانے اور نئے کی واضح حد بندی ہوجاتی ہے نئے اور عظیم کی جستجو زبان کے بنے بنائے سانچوں کو توڑ دیتی ہے نئے اور پرانے کا جھگڑا چکاتے ہوئے افتخار جالب رقمطراز ہیں :

لسانی تشکیلات کی جامعیت اس ناقص گروہ بندی کی مذبذب کیفیت کا قلع قمع کرتے ہوئے طرفین کے دلائل کو مانتی ہے اور پچھلے قضیے یوں چکاتی ہے کہ اولاً نئے اور عظیم کی بدولت زبان کو جو شدید نقصان ہوا ہے اسے تسلیم کرتی ہے اور ثانیاً بنی بنائی زبان کا اصل اصول جس قدامت ،تنگ دامانی اور اجنبیت کا ضامن ہے ،اسے تازہ بہ تازہ، نو بہ نو کے حق میں سم قاتل گردانتی ہے۔ بنی بنائی زبان کا تصور متعین موضوعات سے علیٰحدگی میں ممکن نہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی نئے اور عظیم موضوعات رونما ہوں گے۔ بنی بنائی زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنا ناگزیر ہے کہ نئے پن کی بدولت اور عظمت کی وجہ سے متعین اور معمولی کا درجہ غیر متعین اور غیر معمولی ہو جائے گا۔[۱۳]

افتخار جالب کی نظموں میں موضوعات کی بوقلموں کیفیتیں نئے اور عظیم کی جستجو ہی کی بدولت ہیں۔ وہ موضوعات جو روائتی شاعری کا طرہ امتیاز ہیں یا جنہیں جدید شاعروں نے برتا ہے افتخار جالب اور اس کے مقلدین کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔ اس لئے کہ تاریخ علم اور ثقافتیں مسلسل تبدیلیوں کی حالتوں میں ہیں۔ اساطیری پنہ گاہوں میں اپنا وجود چھپانے والے شعرا شاعری اور سماجی ارتقا کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ نوحہ نویسی اور رونے دھونے کی شاعری شخصیت اور ضمیر کی کمزوری کی علامت ہے۔ خود غرضانہ تعشق کی روداد یں سماجی سپر سٹرکچر کے غلبے کی عکاس ہیں۔ محض ماضی پرستی حال کے عذابوں کے شکنجوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں صرف اور صرف وہ شاعری قابل احترام ہے جس میں یا تو مروجہ سپر سٹرکچر کی نفی کی گئی ہے یا انسانی وجود کو استحکام آشنا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یا جس میں غاصبانہ رویوں سے معمور سامراجیت کے خلاف بھرپور احتجاج کیا گیا ہے۔ وہ شاعری جو انسانی شعور کو ترقی کے مدارج طے کرواتی ہے حقیقت میں حقیقی شاعری ہے۔ افتخار جالب نئے عہد کے نئے شعور کے نمائندے ہیں۔ یہ نیا عہد قدامت پسندی کی پنہ گاہوں پر حملہ آور ہے، نوحہ نویسی اور آہ وزاری کی بجائے احتجاج اور مدافعت کے اسالیب کو عظیم جانتا ہے۔ اجتماعیت اور ایسی اجتماعیت جس میں فرد کا انفرادی استحقاق قائم رہتا ہے اس عہد کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ حال کی دہشت ناک شکلوں کا سامنا کرنا اور ان پر قوتوں سمیت حملہ آور ہونا نئے زمانے کے شاعر کا خصوصی موٹو ہے۔

افتخار جالب انسان کو روائتی اور میکانکی پابندیوں سے آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں۔ آزاد انسانی انتخاب جس میں کوئی کسی کا غلام نہ ہو اور کوئی کسی کے لئے استعمال کی شے نہ ہو۔ جاگیر دارنہ اور سرمایہ دارانہ آؤٹ لک کا ساختہ انسانی شعور افتخار جالب کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ ان کا تصور انسان ان کی نئی نظموں ''یوم مئی کا جلوس''، '' بنگال کی خوناب مہک''، '' یداللہ فوق ایدیھم''، '' وقنا عذاب النار''، '' خاک و خون کا مجاہدہ''، '' کشمیر کے حوالے سے'' اور '' جان گھلاتے خواب'' میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ یہ انسان انفرادی، طبقاتی، سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی آزادی کی تمناؤں سے معمور ہے۔ اپنے انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے طبقاتی اور

قومی جدو جہد آزادی کو افضل گردانتا ہے۔ افتخار جالب کی نئی نظمیں ان کے اولین شعری مجموعے کے اسلوب سے بہت مختلف ہیں۔ ان میں موضوعات کی منظّم معنوی تشکیل کا اہتمام ہے۔ استعارے اور علامتیں پیچیدہ اور مرکباتی نہیں ہیں۔ خیال کا پھیلاؤ متعینہ جہتوں میں ہے۔ قاری کے لئے زیادہ مسائل پیدانہیں ہوتے۔ البتہ الفاظ کے معاملے میں افتخار جالب نے عربی اور فارسی زبانوں کی تراکیب سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ اساطیری رابطوں اور موضوعات سے متعلقہ حقائق کا خصوصی خیال رکھا ہے۔ جبر اور غلامی کی دہشت ناک صورت حال سے دو چار شاعر اپنے تجربات ،وار دات اور تصورات کے ایسے زاویوں پر نظر رکھتا ہے جو اس کی وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مروجہ سماجی ڈھانچے کے قوانین سے ٹکرانا اور اس کے تضادات کو واشگاف الفاظ میں ظاہر کرنا افتخار جالب کی ان نظموں میں نمایاں ہے۔ ان نظموں کا آؤٹ لک بنگال ،کشمیر، فلسطین ،قومی آزادی اور طبقاتی مسائل تک پھیلا ہوا ہے۔ افتخار جالب کی شاعری میں نئے اور عظیم کا صیغہ واردات ان حوالوں سے بھی مرتب ہوتا ہے۔ ان کی نسل سے قبل ترقی پسندوں نے اس قسم کے مسائل کو میکانکی ،ازراہ فیشن، برائے ترجمانی اور واعظانہ لب ولہجہ میں بیان کیا ہے۔ تخلیقی لب ولہجہ محنت کا متقاضی تھا۔ وہ محنت ان کے دائرہ کار میں نہیں تھی۔ صورت حال کو اپنے وجود اور داخلیت کا حصہ بنا کر پیش کرنا ان کا وتیرہ نہیں تھا۔

افتخار جالب کی نو ترقی پسندانہ روش نے ان کے کندھوں پر پر اسرار اور مخفی انسانی شعور کی لفظی تزئین کا بوجھ ڈالا ہے۔ انہوں نے رائج الوقت سماجی اور افادی رشتوں کے منفی اور مثبت رجحانات کی دریافت کو اپنے شعری ویژن کا حصہ بنایا ہے۔ ان پر ان بہروپیوں کے اسرار بھی کھلے ہیں جو نام تو نچلے طبقے کے مسائل کا لیتے ہیں اور کام جابر طبقوں کے لیے کرتے ہیں۔ دیہہ خداؤں کے ولی نعمتوں کی ہر سازش پر بھی ان کی نظر ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وقت کی یلغار تسقی قلب درندوں کو تہہ و بالا کردے گی، جس کے ساتھ خدائی کا ہاتھ ہوگا وہ فتح یاب ہوگا۔ شاعری اور ادب کا وظیفہ وفا شعاری اور حاکموں کی خدمت نہیں ہے، درون آدم کی راستی عصر جدید کے شاعروں کو احتجاج کا سلیقہ بخش رہی ہے۔ مظلوم آبادیوں میں افتخار جالب نے عامتہ الناس کو خاک وخوں کے مجاہدے سے گزرتے دیکھا ہے اور اپنے آزادی پسند رویے کا اعلان کیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ نے جسم فروشانہ بصیرت کا طلسم توڑ دیا ہے۔

شاعرانہ زبان اور انسان کے رشتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ زبان نہ صرف انسانی جوہر کی تخلیق کا وسیلہ ہے بلکہ اس کے بطن کے تخلیقی امکانات انسان کو نئی صورت حال سے بھی دو چار کرتے ہیں۔ یوں بھی زبان انسان کی مانند زندہ حقیقت ہے۔ انسان زبان سازی کرتا ہے یعنی زبان میں اپنی تخلیق کا کام سرانجام دیتا ہے۔ یہ تخلیق شدہ زبان انسان کو تبدیل کرتی ہے۔ شاعری جس میں شاعر کو اپنی شخصی صورت حال کی کلیت وضع کرنا ہوتی ہے۔ زبان ہی کو اپنا خصوصی مظہر جانتی ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ نئے شاعر صرف ونحو کے افعال کو الٹی پلٹی ترکیبوں اور بدعتوں کے ذریعے بگاڑنے پر تلے ہیں کیونکہ اس کے معانی تو صرف یہ ہیں کہ شاعر افادی زبان کے نرغے میں ہوتا ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ شاعر زبان سے بحیثیت ایک آلے کے مکمل طور پر انقطاع کرلیتا ہے۔ وہ الفاظ کو نشانوں کے طور پر نہیں اشیا کے طور پر استعمال میں لاتا ہے۔ الفاظ جب اشیا کی نمائندگی کے لئے مخصوص ہوتے ہیں تو وہ نثری اور افادی استعمال کے زمرے میں آتے ہیں۔ یوں وہ روز مرہ کی ضرورتوں اور احتیاجات کے مطابق استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں مفید رسمی آلات بھی کہا جاسکتا ہے۔ لفظ کا بطور شے استعمال روز مرہ کی ضروریات اور احتیاجات

کے مطابق نہیں ہوتا۔ شاعری میں ہر لفظ اشیائے فطرت کی صورت اختیار کرتا ہے۔

افتخار جالب صرف ونحو کے افعال بگاڑنے سے سروکار نہیں رکھتے۔ انہوں نے زبان کو بحیثیت آلہ یا مفید رسمی اوزار کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس میں شئیت کو تخلیق کیا ہے۔ اس عمل میں صرف ونحو کے مروجہ معیارات کو زک پہنچی ہو یا مفاہیم کے قدیم سانچے ٹوٹے ہوں۔ ان کی بلا سے انہیں تو اپنی شاعری میں اپنے انسانی جوہر کی تخلیق مقصود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زبان کو زندہ حقیقت کے روپ میں گرفت میں لیا ہے۔ اپنی مخصوص اور منفرد زبان کی تشکیل کی ہے۔ اس تشکیل شدہ زبان نے انہیں نئے امکانی اظہار کی راہیں سجھائی ہیں۔ماخذ کی نظموں کی زبان نے قدیم بنجر کی زبان کے امکانات کوجنم دیا اور قدیم بنجر کی زبان کے امکانات نے ان کی نظموں کو نثری نظموں کی زبان کے امکانات سے وابستہ کیا۔ ان کی زبان روز مرہ کی ضروریات اور احتیاجات کی تکمیل سے لاتعلق ہے۔ یہ صحافت یا مکتوب نگاری کی زبان نہیں، نہ ہی رومانیت اور کلاسیکیت سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ صحافتی بیانات، رومانیت اور کلاسیکیت کی شاعری رائج الوقت یکسانیت اور معین معیارات کی شاعری ہے یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ بٹیلز() ہوں کہ اینگری ینگ مین() سوریلسٹ ()ہو کہ دادسٹ() علامت پسند ہوں کہ حقیقت نگار افتخار جالب کا ان تحریکوں کے رویوں اور رجحانات سے یا ان کی یکسانیت اور معین معیارات سے کوئی مستقل سم بندھ نہیں۔ وہ پرانے جہان معانی کے وضع کردہ پرانے ہیئتی سانچوں کو قبول نہیں کرتے اپنا نیا جہان وجود میں لانے کی فکر میں ہیں۔ رومانیت اور کلاسیکیت کی شاعری اور زبان معاصر امکانات کی تعمیر اور تخلیق کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ ایسی شاعری کی زبان عموماً محض ہیئتی تبدیلیوں یا محض خطابت، نعرہ بازی اور وعظ جیسے غیر تخلیقی رویوں کا شکار ہو کر معین معیارات ہی کی مختلف صورتوں کو وجود میں لاتی رہتی ہے۔ ایسے شاعروں کے تجربات آئے دن کی ضروریات اور احتیاجات کے تابع ہوتے ہیں۔ میکانکی اور روائتی شاعری جمع ہوتی ہے۔ تخلیقی شاعری جس میں انسان بھی تخلیق ہوتا ہے اور زبان بھی، یہ شاعر اسے تسلیم کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ افتخار جالب نے روائتی زبان اور میکانکی تصور انسان کو اپنی شاعری کی اقلیم سے خارج کیا ہے۔

شعر سازی کے روائتی تصورات میں الفاظ و معانی کے مخصوص سانچوں کی تقلید کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی۔ ڈھلے ڈھلائے موضوعات اور بنی بنائی زبان روائتی شعرا کا کل اثاثہ، مخصوص معنوی سیاق و سباق اور مخصوص صناعی مصرعوں کی ساخت میں ٹکسالی گرامر کی پابندی ناگزیر تھی۔ علم بیان اور بحور کی حاکمانہ گرفت دیدنی تھی، شاعر کے تصورات تجربات اور محسوسات ان کے تابع تھے۔ یوں بندھی ٹکی اور گرامرانہ شاعری تو وجود میں آتی تھی۔ حقیقی شاعری مستقل التوا کے عالم میں تھی۔ روائتی ادوار کے گنتی کے شعرا نے شاعری کو اپنے وجود کے حقیقی تقاضوں کے اظہار سے ہمکنار کیا، انہوں نے اس کی ہیئتی اور فنی تنگ دامانی کا شکوہ بھی کیا ہے۔ سماجی کل کے سیاق وسباق میں انفرادی انسانی جوہر کی آئینہ بندی اور اس کے امکانات کی تخلیق کا حقیقی شاعرانہ فریضہ ادا نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ التوا کسی حد تک آزاد نظم کی ہئیت کے تعارف کے بعد ختم ہوا۔ ہمارے اکثر آزاد نظم گو شاعروں نے ہئیت تو نئی اختیار کر لی لیکن تجربات محسوسات اور تصورات کا ہمہ جہتی پھیلاؤ رکھنے والی نئے عہد کی نئی کائنات کا مکمل شعری سمٹاؤ ان کی گرفت سے باہر رہا۔ لسانی تشکیلات کی تخلیقی صورتوں نے ان امکانات کو حقیقت میں ڈھالنے کی جانب پیش قدمی کی لسانی تشکیلات موضوع اور ہئیت کی ٹھوس کلیت کی صورت ہے۔

موضوع اور ہئیت کو دو الگ الگ خانوں میں رکھنا روائتی شعر یات کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ افتخار جالب کی نظموں میں موضوع اور ہئیت کی کلیت کی شناخت ہوسکتی ہے، ان صداقتوں کی ایسی تشکیل ابھری ہے روائتی تشریحی مقاصد کے لیے جس کے حصے بخر سے نہیں کیجا سکتے۔ افتخار جالب فن پارے کو کلی حیثیت میں دیکھنے کے حامی ہیں۔ اسے تمثال، استعارے، علامت اور ہئیت کے اجزا میں بانٹ کر پرکھنے سے گریزاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماخذ اور اس کے بعد نظموں کو تمثالی استعاراتی علامتی اور ہئیتی خانوں میں منقسم کرکے پرکھنے کی کوشش کرنا سعی لا حاصل ہے افتخار جالب کے اسلوب شاعری میں یہ سب وسائل اظہار اپنی ذاتی اور انفرادی حیثیتیں کھو دیتے ہیں۔ ہر شے تجربات واردات اور تصورات کی کٹھالی میں پگھل کر ایک ہوجاتی ہے۔ افتخار جالب کی شاعری میں الفاظ موضوعاتی کل کے لاینفک رابطوں کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی مفہوماتی دنیا راشد اور میراجی کی تشکیل کردہ مفہوماتی دنیا سے کلی طور پر مختلف ہے۔ لسانی تشکیلات میں الفاظ بطور اشیا استعمال کیے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ افتخار جالب کی شاعری میں پھیلاؤ اور ہمہ جہتی معاملت کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ قاری کو بھی دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔ فہم وتشریح کے روائتی معیارات مکمل طور پر ناکارہ ہوتے نظر آتے ہیں۔ افتخار جالب معانی، بندشِ الفاظ، ترتیب وتزئین اور مخصوص تاثراتی قرب و بعد سے اپنی نظموں میں ایک خود رو جنگل کی سی بوقلمونی پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔ قدیم اور روائتی ویژن رکھنے والوں کے لیے اس جنگل کی تہہ داریوں کی شناخت ناممکن ہے۔

جان پریس نے اپنی کتاب میں تہذیب کی روز افزوں پیچیدگیوں، نفسیاتی تحلیل کی دریافتوں، آزاد اختلاف کی ذہنی مشقتوں، فلم اور ریڈیو کی نئی تکنیکوں اور نبض زندگی کی، تیز رفتاریوں کے حوالے سے بورژوا جمالیات کا نظریہ دینے کی کوشش کی وہ لکھتے ہیں :

> سائنس اور دیگر معاملات کی مندرجہ بالا صورت حال کی بدولت، ہمارے مذاق میں تراشیدگی، نفاست اور چابکدستی آ گئی ہے ان سب چیزوں نے مل ملا کر شاعری کے لیے ایسے معیارات وضع کیے ہیں جن کے مطابق صرف ایسی نظمیں قابل قبول رہتی ہیں جن میں جذبات کا خالص پن اور استعارہ وتمثال کا ایک مکلّف تارو پود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تیز اور پرقوت طبیعتیں اس بات کو روا نہیں سمجھتیں کہ پرانے زمانے کی شاعری کی طرح کسی موضوع اور مضمون کو لے کر اس پر منطقی تسلسل دل جمعی اور فراغت کے ساتھ بحث کریں۔ اس قسم کی بحث ہمیں بھرتی کی معلوم ہوتی ہے اور ہمیں اس سے کوفت ہوتی ہے۔[۱۴]

جان پریس کا پرانی شاعری پر تبصرہ درست ہے جہاں تک نئے زمانے کی چابکدستی، تراشیدگی، نفاست اور تکلفاتی معیارات کا تعلق ہے جان پریس ( ) کے دماغ میں نئی طویل قامت عمارتوں کی جمالیات، نئے خوبصورت باتھ روموں کی تزئین، نئی خوبصورت کاروں کی بوقلمونیاں ہیں۔ یہ جس تہذیب کے پس منظر میں ہے وہ کمپیوٹر کی تہذیب ہے اس تہذیب کی تراشیدگی نفاست اور چابکدستی ریاضیاتی اور میکانکی ہے۔ نئے سائنسی آلات و ایجادات کے وسیلے سے پیدا ہونے والی میکانکی انفرادیت کی تہذیب جہاں انسان گینڈے بنتے چلے جارہے ہیں۔ جہاں کی گلیوں کی غلاظتوں اور عوام کی بدحالیوں اور بدصورتیوں کے اظہار کے لیے بہریخت کو تھری پینی اوپرا لکھنا پڑتا ہے اور جارج آرول کو، جہاں کا میو سارتر سمون ڈی بوے ائر اور ژاں ژینے تہذیبی گراوٹوں کی دستاویزیں مرتب کرتے ہیں۔ افتخار جالب کی نظموں میں جان پریس کی ترتیب دہندہ جمالیات کو منہا کیا گیا ہے۔ ان کے تصور جمالیات میں

کمپیوٹر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ان کی نظمیں زندگی کی روز افزوں سیاسی پیچدگی طبقاتی کشمکش نفسیاتی وانتلافی معاملات کی غیر متوقعیت کے پس منظر سے ابھرتی ہیں۔ ان کی فنی تراشیدگی، نفاست، چابکدستی اور ترتیب وتنظیم ریاضیاتی میکانکی اور فارمولا جاتی نہیں ہے۔ ان کے جذبات تجربات واردات اور تصورات کی صورت حال کا تخلیقی آئینہ ہیں۔

افتخار جالب کی شاعرانہ دقیق نظری بین الاقوامی ادب کے مطالعے اور قوت متخیلہ کی وسعتوں کی بدولت اردو قارئین کو منفرد انداز کی نظمیں میسر آئی ہیں۔ احساساتی و تاثراتی وعقلی، تحقیق وتفتیش ان نظموں کے ہر مصرعے میں جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ان نظموں کے تجربے کی تشریح اور خصوصا روائتی شاعری کے انداز تشریح سے، خاصا وقت طلب کام ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے نئی شعری لغت تیار کی ہے۔ ان کے تجربات و جذبات کو گرفت میں لینے کے لیے بھی نئے طریق تشریح کی ضرورت ہے۔ ان کے دریافت کردہ معنوی ولسانی علاقوں کے تعین کے لیے ان کا وضع کردہ لسانی تشکیلات کا نقطہ نظر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ان کے تجربات میں مفاہیم کچھ اس ابتری کی حالت میں ہیں کہ لفظ سے لفظ تک اور مصرعے سے مصرعے تک ان کی تہوں میں اترنا کٹھن کام ہے۔ ہر نظم کی مجموعی تلازماتی اور لسانی تشکیلاتی صورت حال پر مکمل نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جس طرح ہم خیال گائیکی کی اتھاہ گہرائیوں سے حظ اٹھاتے ہیں ان نظموں کی معنوی کمپوزیشن() میں اسی قسم کی حالتیں ہیں۔ ہم ان کے شعری تجربوں کی غزلیاتی تشریح کرنے کی کوشش کریں گے تو شاید ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آپائے گا۔ اس ضمن میں ان کی ذیل کے عنوانات کی نظمیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔'' خواب مرا پرتو ہیں''،'' مجھ سے میرا نام نہ پوچھو''،''رگ و پے کی شہادت''،''راستہ چھوڑ دو''،'' فقط سامنا ہے''، ''سمندر امنڈتا رہے گا'' اور'' ہری ٹہنیاں'' وغیرہ وغیرہ ولم جیمز کا کہنا ہے کہ تجربہ کبھی محدود نہیں ہوتا کیونکہ یہ کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ یہ ایک وسیع صلاحیت کا احساس ہے۔ مکڑی کا بہت بڑا جالا ہے۔ جس کا تانا بانا نہایت مہین اور ریشمی دھاگوں سے بنا ہے۔ یہ جالا انسانی شعور کے کمرے میں پھیلا ہے۔ اس کی گرفت میں چھوٹے سے چھوٹا ذرہ آجاتا ہے، اسے شعور کی فضائے محیط کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اگر شعور زبردست قوت تخیل کا مالک ہے یا کسی جنئیس کا شعور ہے تو کوئی شے اس کے دائرے سے خارج نہیں رہتی افتخار جالب کے تجربے کو بھی اسی حوالے سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ ان کا شعور ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں ہے ایک تجرباتی کل سے متعلق ہے۔ ان کے شعور کی فضائے محیط نے ان کی نظموں کو مخصوص لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ ان کی نظموں میں تجربے محض تجربے نہیں رہتے کہ وہ اپنے آؤٹ لک سے بے نیاز ہوجائیں اور اپنے جذبوں بھرے شعوری رویوں کا اظہار نہ کریں۔ ان کے تجربے ان کی علمی زندگی کے خمیر سے تیار ہوئے ہیں۔ آر۔ ایم۔ رلکے نے شعری تجربے کی ماہیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> تجربے ہمارے اندازہ نگاہ ہماری حرکات وسکنات ہمارے اجزائے فطرت اور ہماری شخصیت میں رچ بس کر ہمارے جسم و جان کا حصہ بنتے ہیں۔ تب پرلے درجے کے نادر لمحے میں ان کے بے نام گروہ میں سے کسی نظم کے پہلے الفاظ ابھر آتے ہیں۔

افتخار جالب کے شعری تجربوں میں ان کا انداز نگاہ حرکات وسکنات اجزائے فطرت اور شخصیت کے متنوع پہلو اظہار کی بھٹی میں پگھل کر نئے جوہر کی ترتیب کا باعث ہیں۔ ان کی تازہ نظموں کے چند اقتباسات:

ہر ہوسناک بہیمانہ شہنشاہی کے دن لدنے کو ہیں

ہر الولامر کو مژدہ ہو کہ قہاری کے دن تھوڑے ہیں سر کچلیں گے
چوراہوں میں لٹکائیں گے خوش بختی کے ان غاصبوں کو پوچھیں گے کس منہ سے غریبوں کے
جلوسوں کی قیادت کو نکل آئے تھے؟ ہاں فکر نہیں
سارے لعینوں کی زبان گدی سے کھچ جانے کو ہے۔
(یوم مئی کا جلوس) [۱۵]

.....

بنگال کی خوننا ب مہک روح کو سرشار کیے جاتی ہے
گر روکنا چاہو بھی تو بے کار کی خوش فہمی ہے
سب طلسمات بکھر جائیں گے جمہور کا سیلاب حقیقت کے شگافوں سے
امڈتا ہوا معمولی سی تاخیر کی زحمت ہی سہی شرق سے تا غرب
ہر اک شے کو بہا لینے پہ قادر ہے
(بنگال کی خوننا ب مہک) [۱۶]

.....

وہ جو ہاتھ ہے محنتی برکتوں والا جسے وقت کا ظلم اجاڑتا ہے مرے ہاتھ میں ہے
میرے ساتھ بھی ہے۔
ترے پاس تو خواب ہی تھا ترے ہاتھ میں ہاتھ نہ تھا ترے ساتھ خدائی
کا ہاتھ نہ تھا
مرے خواب کا ہاتھ کدھر گیا؟
مرے خواب کا ہاتھ جہاں میں ہے
(یداللہ فوق ایدیہم) [۱۷]

.....

ابھی خرابہ تو نامکمل ہے گا ہے گا ہے غریب شاعر کی باؤلی چیخ سنسناتی ہے
درون آدم کی راستی احتجاج کرتی ہے
ہمیں نہیں چاہیے خدارا ہمیں نہیں چاہیے

ہمیں مکمل سکوت دے دو
ہمیں جہنم کی سختیوں سے رہائی بخشو
(وقنا عذاب النار) [۱۸]

.....

گھبرائیو نہیں قہر اٹھایا ہے تو خوشیوں کو بھی بانٹیں گے ذرا ہاتھ کھلے رکھنا حقیقت
بھرے خوابوں کی خبر آئے گی یلغار کی صورت
ترے در سے مرے گھر تک
(کشمیر کے حوالے سے)

افتخار جالب نے مروجہ نو آبادیاتی ماحول کی اقدار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے عہد کے انسان کی غیر انسانی صورت حال کو اس کی تمامتر غلاظتوں بے معنویتوں اور پیچیدگیوں سمیت پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں مختنیں عصمت کی طرح لٹتی نظر آتی ہیں۔ دن لوٹ کے ،لکھ لوٹ کے دکھائی دیتے ہیں۔ عیاش امرا جام و رقاصہ سے کھیلتے ہیں۔ جسم بھنبھوڑتے ہیں۔ دوسری طرف زمانے کی ہوا پلٹتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہے اور ہوسناک بہیمانہ شہنشاہی کا انجام آنکھوں کے عدسوں میں تیرنے لگا ہے۔ بنگال کی تحریک کو وہ محض گھیراؤ کی تحریک نہیں کہتے۔ تنظیم کے افلاک میں کوندے کی لکیر جانتے ہیں۔ وقت کی یلغار شقی قلب درندوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ انہیں جبر کی عیاشی سے مخمور شیطانوں کا خاتمہ کچھ زیادہ دور نہیں لگتا۔ جہاں محنتی ہاتھوں کا راہنما معلوم ہوتا ہے۔ وہ اطاعت گزاروں کی خوشبوئی فتخار جالب، جسے لفظوں کی دھما چوکڑی مچانے والے کا نوحہ لکھ کر عبدالرشید نے اس معنوی ہیت کے مغربی امکانات کو مشرقی شعریات کا حصہ بنانے کی فنکارانہ کوشش کی ہے۔ عبدالرشید کی شاعری کے نو مجموعے زیورِطبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان میں انہوں نے شاعرانہ امیجری کے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عبدالرشید نے انگریزی شعر و ادب میں ایم اے کرنے کی بعد عالمی شعر ونثر کے مطالعے کی طرف توجہ دی اور اس حوالے سے بالیقین کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی اسم شاعر یا نثر ان کی نظروں سے بچ نہیں پایا ہوگا۔ فلم، تھیٹر اور سیاحت سے ان کی دلچسپی نے ان کے ذہنی افق کو مزید وسیع کیا۔ مجید امجد اور انور ادیب کی یاد میں نظمیں لکھنا ان کی شعر دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ افتخار جالب کہ جسے ابھی اردو شاعری کے قارئینے بھی مکمل طور پر ایکسپلور نہیں کیا عبدالرشید کے ان دوستوں میں سے تھے، جن کی فکری فارمولیشنز نے انہیں شاعری کے کثیر الجہات گوشوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لینے پر قائل کیا۔ افتخار جالب کو عامیانہ شعری نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے انہیں پرکھنے کے لئے عصر حاضر کی مغربی تنقید کی جدید ترین جہتوں کا مطالعاتی اور تجزیاتی احاطہ امر لازم ہے۔ مآخذ اور یھی ھے میرا لحن جیسے شعری مجموعے اردو شاعری کی تاریخ میں حیرت زا انفرادیت کی آئینہ بندی کر چکے ہیں۔

اے خوشا بخت کہ امریکہ نے
آداب سفارت کی بحالی کا ارادہ باندھا

ویت نام ایک نئے دور میں داخل ہو گا
صنعت وحرفت وکلچر کی فراوانی میں
کوئی قلت ہے تو بس اتنی کہ
الفاظ کی ناداری ہے!
وہ زباں۔۔۔جس میں فرانسیسی جواں
''ہیّا ہو۔، ہو چی من و ہو چی من وہو چی من وہو چی'' گاتے
سارے عالم کے لیے قبلہ امید بنے
منہ لگی شیریں دہن چھٹتی نہیں
ادبدا کر یہی کہہ بیٹھتی ہے: کیسی فراوانی ہے؟
کہ حلقوم تو حلقوم ہے: پابندی میں پاگل سا جگاڑ
امریکی سلینگ ان کے لب ولہجہ و لیرنکس کی ہر بافت کو گھیں کرتا ہے
شیر بکری کے نئے گھاٹ کے دوارے، آ رے
ورلڈ آرڈر کے بہیمانہ طلسمات نے ڈیرے ڈارے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے، دیکھیے، مشروم فشن
شیر وشکر ہوتی زبانوں کا بطن، قربت و لاچاری کا لنگوا کچرا
ٹاکسک ویسٹ میں تبدیل کیے دیتی ہے: تا حدنگہ زیست کا کوڑا ملبہ
۔۔۔ہیروشیما کے دم عیسٰی کا ہر لحظہ نیا کن فیکوں!
پھول کھلے، تازہ زباں ۔ دید کے فٹ پاتھوں پہ آ جایئے سرکار، ادھر دیکھیے
یہ کون جواں، رقص میں گلنار ہی گلنار، تر رڑ، ڈز
زیست کا کوڑا ملبہ [19]

افتخار جالب نے ڈاکٹر عزیز الحق کو اپنا مرشد کہا ہے۔وہ ینگ پیپلز فرنٹ کے قائد تھے اور میرے بھی مرشد تھے۔ ینگ پیپلز فرنٹ جاگیردار حکمرانوں کے عہد میں سیاست کا میدان تو نہ مارسکی اور دیکھا جائے تو پاکستان میں بائیں بازو کی کسی بھی پارٹی یا گروپ کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔'ہم کے سب تیرے پرستاروں میں ہیں اے طلاموس کبیر'۔جس طلاموس کبیر کا تذکرہ مقصود ہے اس کے سجدہ گزاروں میں جاگیردار، سرمایہ دار، نوکر شاہ، قضاۃ اور تیر وتفنگ کے حامل خاکی شامل ہیں۔اپنے باہمی تضادات کے

با وجود یہ قوتیں عوام استحصالی اور غربا دشمنی میں یکتا و طاق ہیں۔اس لیے افتخار جالب نے ڈاکٹر عزیز الحق کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس شاعری کو سامراج کی سازش قرار دیا جو طلاموس کبیر اور اس کے سجدہ گزاروں کی مقاصد بر آری کے لیے لکھی جا رہی تھی اور بلا شبہ وہ نئے زمانے کی نئی شاعری تھی کہ جس سے ہمارے آج کے ادبی رسائل بھی پٹے پڑے ہیں۔ان نظموں کا آنکھوں میں دھول جھونکنے والا مواد تمام تر روایتی شعری نفاستوں سے اٹا پڑا ہے۔افتخار جالب نے ڈاکٹر عزیز الحق سے یہ سبق لیا کہ اگر کسی بات کو حق مان لیا ہے تو پھر اس کی روشنی ہی میں نظریہ سازی ہونی چاہیے۔یوں افتخار جالب کے جدید ترین مغربی فکری تحریکوں کے مطالعے کو ایک جہت عطا ہوئی۔انہوں نے اچانک اعلان کیا کہ اصل انقلابی شاعر تو حبیب جالب ہے کہ جو شعر کو مظلوم عوام کی خدمت گزاری کا وسیلہ جانتا ہے۔حاکموں اور طلاموس کبیر کے سجدہ گزاروں کی خدمت کرنے والی شاعری اور فکشن وظیفہ خواری کے لیے لکھا جاتا ہے۔موقعہ پرستی اس کی گھٹی میں ہے یعنی اگر پرانا بادشاہ نہ رہے تو نوکر پیشہ شاعروں کی دعا بددعا ہو جاتی ہے۔

لسانی تشکیلات اور اس کے حامیوں کو معتوب کرنے والے نقاد، شاعر اور افسانہ طراز اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے مگر یہ نظریہ فنی اور علمی بالیدگی کا امین تو تھا ہی، اس میں انسانی تاریخ میں موجود انسانیت پر ہونے والے تمام مظالم کی داستانوں کو مشعل راہ بنانے کے لیے شعوری سطح پر کاوشیں کی گئیں۔حبیب جالب کے ترقی پسند نقطہ نظر کو بھی اسی پس منظر میں پذیرائی ملی اور ہر اس شاعر اور ادیب کے نظریات کو فروغ دیا گیا کہ جس نے طلاموس کبیر اور اس کے سجدہ گزاروں کی بالواسطہ یا بلا واسطہ توصیف و تعریف کی اور ان کے فکری اور تہذیبی منطقی منطقوں کے دائروں میں رہ کر ادب وفن اور شعور و خیال کی نس بندی کے لیے کام کیا۔

افتخار جالب نے ایک نظریہ ساز نقاد کی حیثیت سے اپنی شاعری کو بھی پرکھا اور اس سے برآمد ہونے والے نظری مباحث کی روشنی میں اپنے معاصر مشرقی اور مغربی ادب کا بھی جائزہ لیا۔اپنے نظریات کی بنیاد پر اور ٹریڈ یونین کی قیادت کرنے کی وجہ سے انہیں الائیڈ بینک کی نوکری سے جب ستر کی دہائی میں سبکدوش کیا گیا تو انہوں نے پیپلز پارٹی کے اخبار 'مساوات' سے منسلک ہو کر اس کے میگزین نصرت کی ادارت سنبھالی۔اس سے قبل وہ شہاب اور مساوات میں ادبی کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ان کے ادبی کالموں میں بائیں بازو کے ادبی نظریات کی گونج سنائی دیتی ہے۔وہ سامراجی معیشت و سیاست کے خلاف بحوالہ شعر وادب مختصر مضامین یا کالم لکھا کرتے تھے۔ان میں وہ اکثر اپنے معاصر شعرا کی نظمیں بطور حوالہ لایا کرتے تھے۔کبھی کبھار بین الاقوامی ادب کے مشہور فن پاروں میں موجود کرداروں کو بھی اپنے نظریات کی مزید توضیح وتشریح کے لیے استعمال کرتے تھے مثلاً ان کا ایک کالم ڈنمارک کے شہزادے ہیملٹ کے کردار کی روشنی عصری سیاسی اور معاشی صورت حال کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔افتخار جالب نے اسی سیاق و سباق میں راقم الحروف کی دو تین نظموں کو بھی اپنے نظری حوالوں کی توثیق و تائید کے لیے استعمال کیا تھا۔عباس اطہر، عبدالرشید اور کئی دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے حوالے بھی ان کے اس دور کے لکھے ہوئے مضامین اور کالموں کی زینت بنے تھے۔یہ کالم ان کی عملی تنقید کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ان میں طبقاتی نظام، سامراجی سیاست، مقامی آمریت اور مشرقی پاکستان اور کشمیر وغیرہ کی صورت حال کی روشنی میں انہوں نے اپنے ترقی پسند نظریات کا اظہار کیا تھا۔

اپنی کتاب 'لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر میں انہوں نے 'لاشعر' کا تصور دیا۔ان کا لسانی تشکیلات کا نظریہ زبان میں جس قسم کی توڑ پھوڑ کی بات کرتا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ شاعری میں مطلق متخیلہ کی آئینہ بندی کے لیے مروجہ شعری زبان اور بیانیاتی

سانچوں سے نجات پانا ضروری ہے ورنہ ہمارے شاعر روایت کے حصاروں میں قید رہتے ہوئے ایسے معانی کی تشکیل کرتے رہیں گے کہ جو سکہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔یوں نصابی نقادوں کی بھی موجیں ہیں کہ انہیں فکر و خیال اور زبان و بیان کو مختلف خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کے مواقع نصیب ہو رہے ہیں یعنی وہ ادب کو قدیم، قومی،اصلاحی، رومانی،ترقی پسند، آزاد خیال، جدید، مابعد جدید، ساختیاتی، پس ساختیاتی، تانیثی،انواعی، تاریخی ،نو تاریخی، وجودی، نفسیاتی ، اساطیری وغیرہ وغیرہ کے خانوں میں بانٹ بانٹ کر بھانت بھانت کے علمی اور تحقیقی مقالے لکھ اور لکھوا سکتے ہیں۔ انہیں لاشعر کی کائنات میں داخل ہونے کا سلیقہ اس وقت آئے گا کہ جب وہ روایتی منطق کو محیط شعری منطق سے نجات پا لیں گے۔

لاشعر کی کائنات میں تحلیل نفسی کی مریض اور معالج والی منطق کام میں نہیں آتی ۔سب کچھ یعنی مریض اور معالج 'ایک کٹھالی میں پگھل پانی' ہو جاتے ہیں۔رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی۔'پشو راہ چہ سن، شیہاں چھوٹ وٹی'۔۔۔'ان یدھڑی چڑی دا ددھ جندڑی'،'ہن تے سکھیاں کھیڈن آ گئیاں نیں' ۔۔۔

'کہیے،خیر تو ہے۔۔۔لاحول ولا! ہمیں شوقیہ فکر کی لذتیں ہیں
جنھیں کلمۂ خیر کی لذتیں چاہئیں لے لیں ، لیلائیں لب بستہ
سر نیہوڑائے،ظلم کی تیغوں کے سائے میں، اونچی رکھیں لو
یہ بھی خوب رہی ،مینڈھے رانجھناں وو، مینڈھے رانجھناں وو،
مینڈھے رانجھناں وو[۲۰]

لاشعر میں شاعری کے روایتی طلسمات کی شکست و ریخت کو بنیادی اہمیت ملتی ہے۔ افتخار جالب نے لاشعر کے ڈانڈے جیمز جوائس کی فنتگنز ویک کی غیر روایتی زبان سے ملا کر اردو شاعری کے لیے نئے افق تلاش کرنے کی جانب توجہ دلائی ہے۔جیمز جوائس نے لفظوں کے بطن سے روایتی معانی کے سلسلے غائب کر دیئے ہیں اور ان کی جگہ مختلف ذاتی معنویتوں کو شامل کر کے ادبی قارئین کے لیے نوع دیگر کے تعبیراتی چیلنجوں کے در وا کر دیئے ہیں۔لا شعر میں جس قسم کی ساحری کا عمل دخل ہے اور وہ جس نوع کے طلسم کدوں کے در وا کرتا ہے اردو شاعری کے عمومی قارئین ان حیرت کدوں میں داخل ہونے کے لیے کسی جادوئی اسم کے منتظر ہیں۔ جزو میں کل اور کل میں کلیتیں اور کلیتوں میں کلیتیں دیکھنا فکر و خیال کی نئی شیوگیوں کی جانب اشارہ کنانی ہے۔ طلاموس کبیر کے سجدہ گزاروں اور ان کے حاشیہ نشینوں کو دو جمع دو چار والی منطق ہی سے غرض ہے ۔جواب مضمون لکھنے والے ہر جملے میں موجود نئے مضمون کی جہت نمائی سے دانستہ گریزاں ہیں کہ یوں بہت کچھ پردہ اخفا میں ہی رہ جاتا ہے۔نقال نقاد بھی مغربی نظریہ سازیوں سے مسحور ہو کر استحصالی معیشت، سماجیت، سیاست، جمالیات اور اخلاقیات کو زیر بحث لانے سے گریزاں رہتے ہیں۔افتخار جالب نے فلسفے کو تلقین غزالی کا وسیلہ بنانے سے زیادہ اپنی صورت حال کی تفہیم کے لیے استعمال کیا ہے۔ان کی نظمیں درد و کرب کے احوال کا سامنا کرتے کرداروں اور ان کے وجودی رویوں اور کیفیتوں کی دروبست پر مشتمل ، اردو اور فارسی زبان کی وسعتوں سے واقف قارئین کے لیے مشکل نہیں ہیں۔اس تناظر میں ابلاغ کا مسئلہ ان قارئین کو درپیش ہے جن کے لیے از

خود زبان بھی ایک مسئلہ ہے یا وہ اس کے سماجی، فکری، نفسیاتی، اساطیری اور صوتیاتی مستعملات سے بے خبر و ناواقف ہیں۔شعر و ادب کی فہم میں جسم قسم کی تربیت کی ضرورت ہے اس نے میں شامل کرنا ہوگا۔اس کتاب کے انتساب کو ہضم کرنے کے لیے جسم قسم کی پتھر ہضم ،لکڑ ہضم عقل کی ضرورت ہے اس کے ڈانڈے جیمز جوائس کی فنیگنز و یکی لسانی تشکیلات ، یوجین آئینسکو کی اختراع کردہ تمثیل مکالمی اور ولیم فاکنر کی طویل فقری نثر سے جا ملتے ہیں۔کتاب کرگی کی طرہ امتیازی اس میں دوچار ناموں کا اور بھی اضافہ کر سکتی ہے۔سخن فہمی سینٹ جان پرس، ایذرا پاؤنڈ کو چھوتی ہوئی غالب کے نسخہ حمیدیہ تک جا پہنچے گی۔

افتخار جالب نے خواجہ فرید،ہیلن سکوس (Helen Cixous) انگلیوربکھماں (lngleorg Bachman)، شاہ لطیف، ستاں دال ، فلابیر،جولیا کرستیوا (Julia Kristiva) ، سعادت حسن منٹو،ایل ایس وگوٹسکی (L.S.Vygotsky) ژاں کاکتو، ڈی ڈبلیو ہارڈنگ،سوسن لینگر، سیموئل بیکٹ ، ایلن راب گریے،ٹی۔ایس ایلیٹ،ولم ایمپسن،میلکم مگریج، برٹرینڈرسل،استاددامن،بلھے شاہ،سرجیمزجینز، اے ایس ایڈنگٹن،وٹگنسٹائن،جوناتھن کلّر،جورگن ہیبر ماس،ڈیوڈ ہیلڈ،ژاك ڈریدا،گریگوری المر،مارٹن ہائیڈیگر،سوسن سونتاگ وغیرہ کے انگلش اردو حوالوں اور ترجموں سے اس کتاب کی تنقیدی اور نظری وسعتوں پر مہرِ علم ثبت کی ہے۔ان حوالوں کا لب لباب خود افتخار جالب کے لفظوں میں شعر و ادب میں معروضی کیٹیگوریکل کیٹیگریز کا انہدام اور متخیّلہ کا بول بالا ہے۔

لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر قدیم و جدید فاشسٹ منطق کے دیو کا سر دوہری دہار تلوار سے قلماتی ہے۔نئ تنقید اور نئ شاعری کا یہ مجموعہ فی الاصل ان کے پہلے شعری مجموعے مآخذ اور طویل نظم قدیم بنجر میں ارادی طور پر استعمال کیے گئے لسانی نوادر کو جوازنے کی انتہائی عمدہ مثال ہے۔افتخار جالب نے اپنے دونوں مجموعوں میں اپنی بیانیاتی قوت کا تکثیری و تقلیلی مظاہرہ کیا ہے ۔

لسانی تشکیلات ،مہملات غالب؟ نامِ زنگی کافور، نوٹس کم تراجم کم پولیمکس ، نئ شاعری اور شعریت زدہ تنقید، اقطار السماوات کو پھلانگتے معانی کی ریزش اور پراسس کی ایک اور انگڑائی اُودودودو کے عنوانات کے حامل افتخار جالب کے مضامین ان کی شاعری میں ''نامکمل سطروں کے وفور و اجتماع، بوجھل اور طویل شقوں سے کمزور پڑنے والے افعال، نیم پیدا مفاہیم کے بہاؤ، قطعیت کے شدید انقطاع، ادھر ادھر کی زبانوں کے تلازماتی انسلاکات، مائیکرو کا سمک امیجری کے انفس و آفاق کے میکرو مفاہیم سے زبردستی کے ازدواج اور گویائی کی ارادی تکثیر و تقلیل'' کی نظری وفکری دستاویز ہیں۔

لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر کا پیش لفظ ''ہمارے گلوبلائزڈ پچھواڑے میں بوگن ویلیا کی پھولوں بھری بیلیں'' چلتے چلتے اس شیطان آنت تفصیل کی اجمالی کہانی کہہ گیا ہے جس نے انسان سے اس کے انسان ہونے کا شرف چھین کر اسے مال کماؤ صرفاؤ شے بنا دیا ہے۔افتخار جالب لکھتے ہیں''ہر میگا سٹی جغرافیائی طور پر جہاں بھی ہو ، وہیں ہوتا ہے لیکن اس کے تہذیبی اور ہائی فنانشل آفاق ایک آئیڈیالوجیکل مائتھالوجم سے مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ گلوبلائزڈ بھی ہوتے ہیں'' ان فقروں کو اس پیش لفظ میں موجود ذیل کے جملوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو افتخار جالب کے نظری افکار کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے۔

نہ امریکی اکانومی ری سیشن سے بچ سکتی ہے، نہ دنیا زیادہ دیر تک یونی پولر رہ سکتی ہے۔ یہ دنیا بائی پولر یا ٹرائی پولر ہوا

ہی چاہتی ہے۔ پھر ہم نیشنل اسٹیٹ سطح پر اپنے فائدے کا یونائیٹڈ فرنٹ بنائیں گے۔ اگر نیشنل اسٹیٹ کا انسٹی ٹیوشن دریا برد ہو گیا ہے تو کون سی ایسی تاریکی ہے جس میں سارتیرین انڈیویجئل کی روشنی نہ دمک سکے۔ پھر ہمارے نئے اجتماعی ادارے مثلاً ڈبلیو ٹی او کے خلاف مزاحمتی گروپ، ڈاکٹرز ود آؤٹ فرنٹیرز، آئی ایل او وجود میں آ چکے ہیں۔ سبحان اللہ گلوبل کیپٹل ازم اور ایتھنیسٹی کی ایسی کی تیسی! ایتھنیسٹی اور گلوبلائزیشن زندہ۔ مردہ باد!۔[۲۱]

ایک زمانے میں افتخار جالب نے ایک مضمون لکھا تھا ''شعر گوئی ارتکاب قتل ہے'' وہ ایک غیر معروف رسالے میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے شاعری کے بارے میں جو نظریہ تشکیل دیا تھا اسے'' لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر'' ان کے مضمون ''لاشعر'' کے ساتھ رکھ کر پڑھا جا سکتا ہے افتخار جالب شعر و ادب کے مقبول استعارے'' تخلیق'' کو زیر بحث لاتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تخلیق کے استعارے کا ذیل میں دیا گیا پھیلاؤ فنکار کے لیے طمانیت کے سیر حاصل امکانات رکھنے کے باوجود گمراہ کن، فرسودہ اور غیر حقیقی ہے۔ جالب لکھتے ہیں:

جس طرح مائیں اذیت اٹھا کر بچوں کو جنم دیتی ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے ادیب شعر و ادب کو پیدا کرتے ہیں۔ شعر و ادب کی تخلیق کو اذیت ناکی کا رنگ یہی بچہ جننے کا عمل استعارے کے راستے مہیا کرتا ہے۔ منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ تخلیق نسائی عمل ہے مادری اصول ہے۔ لازم ٹھہرتا ہے کہ غیر تخلیقی عمل کو پدری اصول قرار دیا جائے۔ مادری اور پدری اصولوں کے اختلاط سے ہی نئی زندگی کا ظہور ممکن ہوسکتا ہے۔ ادیب کو کسی نہ کسی طور حمل ٹھہرنا ہی چاہیے۔ اس مشقت کے بغیر تخلیق نہیں ہوسکتی۔ پدری اصول ترتیب، انضباط، تنظیم اور تعقل سے سروکار رکھتا ہے۔ مادری اصول کے خصائص اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ان اصولوں کے صحت مند ارتباط کا اظہار تخلیق ہے۔ شعور پدری تنظیمی اصول کو خدا آپ کا بھلا کرے لاشعور اجتماعی مادری لاشعور سے تقویت نہ ملے تو زندگی یک رخی ہو جاتی ہے۔ شعور اور لاشعور کا یہ میل ملاپ زندگی کو تخلیقی معنویت دیتا ہے۔ خواب اور دن سپنے اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ جبلی، غیر مطمئن تقاضے شعور میں در آنے، تخلیق شعر و ادب خواب کی ساخت کی پیروی کرتے ہوئے نفس غیر مطمئنہ کو ادراک میں لانے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ خواب انفرادی ہی نہیں اجتماعی بھی ہوتے ہیں۔ اجتماعی خواب کو دیو مالا کہتے ہیں۔ شعر و ادب دیو مالائی اظہار کے ذرائع ہیں۔ اسے دیو مالائی طرز احساس ہی کا کرشمہ کہیے کہ ادیب اپنے لیے تخلیق کا وہ استعارہ بھی استعمال کرتا ہے جو خالق کائنات سے متعلق ہے۔ اس استعارے کی مدد سے ادیب خالق کا درجہ پا کر خدائی کا دعوے دار بن جاتا ہے۔ یہ دعوی برملا کرنے کے بجائے خدائے مجازی کی آڑ میں خاوند بن کر اپنی نسائیت کو ضرورت پڑنے پر چھپا لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ تخلیق کا استعارہ فنکار کو عورت اور مرد کے مقامات بیک وقت مہیا کرتا ہے۔[۲۲]

جالب فنکار کو قاتل قرار دیتے ہوئے شعر گوئی کو ارتکاب قتل کا نام دیتے ہیں اور ادب و فن کو قتل و خون کے اعمال ٹھہرا کر دوستوفسکی کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے بار بار قتل منطقے کو تفتیشا ہے۔ اور کہا ہے کہ شعر و ادب محرکات و نتائج کی روحانی کشمکش کی شناخت و دریافت کی کوشش ہونے کے ساتھ ساتھ دیوانگی کے کیفیاتی سلاسل کو بھی شامل تفتیش کرتے ہیں۔ جالب کا خیال ہے

کہ دوستوالفیسکی کے یہاں قتل اور دیوانگی ایک ہو کر روحانی کشمکش کی تشخیص کے لیے اشد ضروری مابعدالطبیعات کی شکل اختیار تے ہیں ۔ نقادوں نے انہیں قتل اور دیوانگی کی نفسیاتی کشود تک محدود رکھا ہے ۔ دوستوفیسکی روحانی کشمکش کی متحرک صورتحال کو قابو کرنے یا شکل دینے کے لیے اس مابعد الطبیعات کا سراغ لگاتا ہے ۔

افتخار جالب نے اورتیگا کے حوالے سے لکھا ہے دوستوالفیسکی نے سچ مچ کے نفسیاتی مطالعے نہیں کیے۔آج اگر اس کے فکشن میں کشش ہے۔تو اس لیے کہ اس نے ناول کی ایک ایسی ہیت تخلیق کی تھی جس میں اصلی نفسیات کے بجائے خیالی نفسیات کو بنیاد بنایا گیا تھا۔اس کی مدد سے اس نے بلاخیز کشش رکھنے والے ادب کی تخلیق کی۔ افتخار جالب کو ریاضیاتی مطالعوں کو بھی شوق تھا چنانچہ اس تناظر میں وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ'' خیالی نفسیات کی تشکیلات کا عمل ریاضیاتی تشکیلات کے عمل سے مماثل ہے'' اپنے ایک اور مضمون'' ابہام ہی ابلاغ کی بنیاد ہے'' میں افتخار جالب نارتھ روپ فرائی کے حوالے سے کہتے ہیں

> ریاضی خارجی دنیا پر اعدادی تبصرہ کے طور معروض کی گنتی اور پیمائش سے بظاہر آغاز پذیر ہوتی ہے لیکن ریاضی دان اپنے موضوع کے بارے میں یوں نہیں سوچتا بلکہ اس کے لئے تو ریاضی ایک قائم بالذات زبان کا درجہ رکھتی ہے ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ریاضی ایک مقام پر پہنچ کر تجربے کے اس عام میدان سے جسے ہم معروضی دنیا، فطرت ، وجود یا حقیقت کہتے ہیں ایک حد تک آزاد ہوجاتی ہے ۔ ریاضی کی بہت سی اصطلاحات ،جیسے کہ غیر منطقی اعداد، کا تجربے کے عام اور مشترک میدان سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ۔لیکن ریاضی کی ان اصطلاحات کے معانی کلیتہً اپنے موضوع کے داخلی رشتوں پر منحصر ہیں ۔ ریاضی کے غیر منطقی اعداد کا الفاظ کی زبان کے قضیوں سے کہ جن کی خصوصیت خود مرکزیت ہوتی ہے تقابل کیا جا سکتا ہے ۔ ہم ادب کی ابتدا تو زندگی یا حقیقت پر تبصرے کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن جس طرح ہم ریاضی میں تین سیبوں سے تین کے عدد تک اور چوکور میدان سے چوکور کے تصور تک پہنچتے ہیں ۔ اسی طرح ایک ناول کے مطالعہ سے ہم ادب بصیغہ عکاسی زیست سے گزر کر ادب بہ معنی قائم بالذات خود مکتفی زبان تک پہنچتے ہیں۔ ادب مفروضاتی امکانات کے وسیلے سے بھی آگے بڑھتا ہے ۔ اگرچہ ریاضی کی طرح ادب بھی مستقلاً سود مند شے ہے لیکن خالص ریاضی کی مانند خالص ادب خود اپنے معانی پر مشتمل ہے ۔ اگر خارجی معروضی دنیا کو مواد خیال کیا جائے تو شروع میں ریاضی اس کو سمجھنے سمجھانے کی ایک صورت ہے لیکن آخر آخر ریاضی اس مواد کا ادراک از خود ریاضیاتی صورت میں کرنے لگتی ہے ۔ جب کائنات کے ریاضیاتی تصور تک رسائی ہو جاتی ہے تو مواد اور ہیئت کی دوئی ختم ہوجاتی ہے پھر مواد اور ہیئت ایک ہو جاتے ہیں ۔ ریاضی اپنے آپ کو تجربات کے عام پہلوؤں سے بالواسطہ متعلق کرتی ہے ۔ تجربات سے کنارہ کشی کے لئے نہیں بلکہ انہیں بالآخر ہضم کرنے کی غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ نیچرل سائینسوں کا یہ تعمیری اصول ہے ۔ یہ انہیں مستقلا شکل وصورت دے کر مجتمع کرتی ہے لیکن خود خارجی ثبوت یا شہادت کی مرہون منت نہیں ہوتی ۔ تاہم طبیعی کائنات انجام کار ریاضی ہی کے شمولات میں دکھائی دیتی ہے ۔ ریاضی کی طرح ادب ایک زبان ہے زبان اپنے طور پر کسی سچائی کی پیش کش تو نہیں کرتی لیکن یہ کتنی ہی سچائیوں کے اظہار کے لئے ذرائع مہیا کرسکتی ہے ۔ ریاضیاتی اور لسانی کائناتیں ایک ہی کائنات کے ادراک کے مختلف ذرائع ہیں ۔معروضی دنیا تجربات کو یکجا کرنے کا ایک عبوری وسیلہ مہیا کرتی ہے ۔ اس سے ایک

ارفع وحدت کا استنباط ایک قدرتی امر ہے ۔ یہ ایک طرح سے عام تجربات وحوادث کی تزئین جمیل ہے ۔اس ارفع تعقلاتی کائنات کی وحدت کے اظہار کے لئے اہل زبان کی دریافت کچھ آسان نہیں ۔۲۳

اس تناظر میں افتخار جالب نے اپنے لسانی تشکیلات کے نظریئے کوایک اور اقلیم میں دریافت کیا ہے ۔ان کے خیال میں لسانی تشکیلات انتہاؤں کی جانب سفر کرتے ہوئے ادب کے استعاراتی اور دیو مالائی سٹرکچر کوتفصیل سے سامنے لاتی ہیں ۔اس پس منظر میں وہ شاعری میں کثرت السنہ کےمستعمل ہونے کا سوال اٹھاتے ہیں اور ژاں کا کتو کے خیالات کی روشنی میں شاعری کو ایک ایسی جدا زبان ہے کا نام دیتے ہیں جوخود مکتفی ہے یا تمام تر اس کی اپنی ہے ۔کا کتو کا کہنا تھا کہ شاعری چند تصورات کو الفاظ سے آراستہ کرنے کی بجائے اپنا خیال الفاظ سے حاصل کرتی ہے ۔وہ دریافت پہلے کرتی ہے ہے اور تلاشتی بعد میں ہے ۔اس نے تفسیر کو شاعری کی ایسی دیوی سے تعبیرا ہے جو شاعروں کے رازوں کا رمزی خط پڑھ لیتی ہے۔ وہ ان کے تاریک اور مخفی شعور کوروشناتی ہے اور ان کے ان مستور معانی کا پردہ چاک کرتی ہے۔جن کا انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا۔ شاعری کی جدلیات انوکھی اور نادر ہے۔ اسی لیے جالب کی رائے میں اورتیگا قتل اور دیوانگی کو بطور مابعد الطبیعات پانے میں کامیاب نہیں ہو پایا۔

افتخار جالب کا خیال درست ہے کہ قتل و غارتگری کے تناظر میں تخلیق کی قلب ماہیت ہوتی ہے۔یوں ادب وفن کی ضرورت، اہمیت ،معنویت اورقدرت کے ایک دوسرے سے متعلقہ رشتے اپنے معانی بدل لیتے ہیں۔ فرائض ،جانبدارانہ رویوں، اطاعتوں اور مصلحتوں میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔فن اور فنکار کا باہمی تعلق بھی بدل جاتا ہے۔ افتخار جالب ''قتل اور دیوانگی کا بطور دہلا دینے والی ما بعد الطبیعات'' ادراک کرنے کے لیے تخلیق کے استعارے کا قلع قمع ضروری خیالتے ہیں۔اپنے اس نظریئے کوٹھوس سیاق و سباق دینے کے لیے افتخار جالب منیر نیازی کی شاعری کو مثال بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہابیل اور قابیل میں اس امر سے نزاع پیدا ہوا کہ وہ جس نے پھولوں کا نذرانہ پیش کیا خوشنودی اور قبولیت کا شرف پا گیا۔خون والا نامراد لوٹا۔خون بیکار نہ گیا۔ دوسرے کا خون لے کر ٹلا۔ ہابیل اور قابیل اس تمثیل کے وہ کردار ہیں جو خون اور پھول پر محیط استعارے کو یوں جنم دیتے ہیں کہ ایک کی دوسرے پر چھوٹ پڑتی ہے۔ اس استعارے میں خون اور پھول توسیعات سمیت اپنی ذات برقرار رکھتے ہوئے خود کو کھوتے ہیں تو ذات کھوتے ہوئے خود کو برقرار بھی رکھتے ہیں۔ یہ استعارہ اردو شاعری میں منیر نیازی کے توسط سے محکم طور پر قائم ہوا ہے۔منیر نیازی کی شاعری میں خون ،دہشت اورآسیب کے ساتھ ساتھ پھولوں کی خوشبو، ملائمت اور رنگ و نور کا ظہور ہوا ہے۔ یہ عناصر متحد ہیں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ ہابیل قابیل نزاع میں بندھے ہوئے، خون میں لتھڑے ہوئے قتل و غارتگری ،بھیانک اجاڑ، منیر نیازی کا موضوع ہی نہیں ما بعد الطبیعات بھی ہے۔ درحقیقت جو چیز منیر نیازی نے اردو شاعری میں مستحکم انداز سے استوار کی ہے وہ یہ ما بعد الطبیعات ہے موضوع نہیں ۔یہ موضوع محدود اصطلاح کی حد تک مرثیہ میں بھی مل جائے گا۔ جو چیز مرثیہ میں قطعاً نا پید ہے وہی منیر نیازی کا عطیہ و رویا ہے ۔قتل و دیوانگی ما بعد الطبیعات بطور ما بعد الطبیعات نہ کہ بصیغہ موضوع۔ سماجی اور سیاسی وقائع نے جو ماحول پیدا کیا اس کی پوری شکل وصورت تو اب واضح ہوئی ہے لیکن منیر نیازی نے ہابیل قابیل استعارے کی ما بعد الطبیعات کے زمرے میں آنے والی حقیقت کی نقاب

کشائی بہت پہلے کر دی۔ اپنی دانشمندی پر حد سے زیادہ نازاں لوگوں کو یہی غم کھاتا رہا کہ منیر نیازی قنوطیت زدہ کیوں ہے؟ اسے ہری بھری آباد دنیا ویران کیوں دکھائی دیتی ہے؟ ان ہوشمندوں کو اب تو تو منیر نیازی کی اس دیوانہ پرسپشن کی معنویت کا پتہ چل جانا چاہیے۔ ایک بات تو یہی نا قابل اعتبار حد تک درست ہے کہ منیر نیازی نے قتل و دیوانگی کی ما بعد الطبیعات متشکل کر کے ہمیں ایک ایسی روح سے آشنا کیا ہے جو پہلے کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ کشت وخون کی محدود معنویت کی پیش از پیش توسیع کی گئی ہے۔[۲۴]

راجندر سنگھ بیدی نے ایک چادر میلی سی میں اس مابعد الطبیعات سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ اس کہانی کی تفصیلات کے پس منظر میں جالب کو اس کے کردار تلوکے کے قتل کا گندھا ہوا یا تکمیل یافتہ استعارہ کئی عناصر پر محیط نظر آیا ہے، حتیٰ کہ سال کے باون ہفتے ہفتے کے سات دن دن کے آٹھ پہروں گھنٹوں اور پلوں میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب چاند لپک کر سورج کو سر سے پاؤں تک گہنا دیتا ہے۔ چادر ڈالنے والا منگل جس جس طرح زن آشوئی کے مرحلے سے گزرتا ہے اس کے تناظر میں تلوکے کا قتل دمکتا ہے۔ افتخار جالب نے اس کہانی کی مظہریاتی تفصیلات میں قتل کی ما بعد الطبیعات کی گھمبیر معنویت کو ابھارا ہے۔ اس کہانی میں موجود واقعات محبت اور تشدد کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جالب کہتے ہیں۔ اس تشدد کی شکل محض تشدد کی نہیں اکثر و بیشتر تشدد میں محبت اور محبت میں تشدد مستور ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے نہ محض تشدد کی نشاندہی کی ہے نہ محض محبت کی۔ جو چیز بالکل نئی ہے وہ ایک ایسا منطقہ ہے جسے مشرق سے دیکھیں تو تشدد دکھائی دیتا ہے اور اگر مغرب سے دیکھیں تو محبت۔ درحقیقت یہ منطقہ تشدد اور محبت کی دو رخی آئی رونک صورتحال کو پیش کرتا ہے'' اس نظری بیان کے بعد جالب دوبارہ دوستو الفیسکی کے کرداروں کی اس داخلیت کی جانب پلٹتے ہیں جو قتل سے متعلق ہے۔ جالب اپنے معنوی تجزیوں کو سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیے میں خودکشی سے لے کر قتل عام تک کے عناصر سے اور زیادہ تقویت دیتے ہیں۔ انہیں نئے شعر و ادب میں جا بجا کشت وخون کی مابعد الطبیعات کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور یوں وہ ان نتائج کا اعادہ کرتے ہیں۔ تشدد اور محبت کا داخلیت سے یہ گہرا رشتہ قتل وخون کی ما بعد الطبیعات سے پھلتا پھولتا ہے۔ جس قدر اس ما بعد الطبیعات پر گرفت شدید ہوگی فنکار اپنے کرداروں کو اتھاہ داخلیت عطا کرنے پر قادر ہوگا۔ قتل وخون کی ما بعد الطبیعات کے زیر اثر ہی پتہ چلتا ہے کہ محبت اور تشدد کیوں لازماً ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہیں۔ قتل وخون کی مابعد الطبیعات اور اتھاہ داخلیت سے وہ ذات پیدا ہوتی ہے جو محبت اور تشدد میں امتیاز نہیں کر سکتی ان کے بغیر پنپ نہیں سکتی دیوانہ وار ان کی طرف بڑھتی ہے۔

افتخار جالب نے اپنے مضمون ''ابہام ہی ابلاغ کی بنیاد ہے'' میں عارف عبدالمتین کا ایک طویل مضمون نقل کیا ہے۔ اس مضمون کا لب لباب خود عارف عبدالمتین کے الفاظ میں یہ ہے:

ادب میں موضوع اور ہیت کا مسئلہ حقیقت میں زندگی اور اس کے حسن کارانہ اظہار کا مسئلہ ہے اور اس کے کسی بھی پہلو پر مذکورہ حوالے کے بغیر نتیجہ خیز گفتگو ممکن نہیں۔[۲۵]

افتخار جالب نے اس امر کو انتہائی افسوس ناک قرار دیا ہے کہ اس مضمون میں موضوع اور ہیت کی مبتدیانہ اصطلاحات پر انحصار کیا گیا ہے اور استدلال کی رفیع الشان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

لسانی تشکیلات میں موضوع اور ہیت کی ثنویت کی گنجائش ہی نہیں۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عارف

عبدالمتین موضوع کو ہیت پر فوقیت دیتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ ہیت کو موضوع پر تفوق حاصل ہے دونوں باتیں اس لئے کہی جاتی ہیں کہ موضوع اور ہیت میں تفریق کو اساسی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اگر موضوع اور ہیت کی دوئی کو تسلیم نہ کیا جائے اور لسانی تشکیلات کو اس متبدیانہ تقسیم سے ماورا ہی رہنے دیا تو پھر موضوع اور ہیت میں کس کو کس پر فوقیت حاصل ہے کا سوال اٹھایا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ نزاعی صورت پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب موضوع اور ہیت کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ شعر و ادب میں زبان موضوع اور ہیت کی علیحدگی کو تحلیل کردیتی ہے۔ جیسی زبان ہوگی ویسے ہی معنی ہوں گے۔ جس نوعیت کے مفاہیم ہوں گے اس قسم کی زبان ہوگی۔ ایک ذرا زبان کو تبدیل کیجئے پھر دیکھئے کہ موضوع کی کیا شکل بنتی ہے۔ زبان کی یہی قدرت موضوع اور ہیت کو لسانی تشکیلات میں جذب کردیتی ہے۔ [۲۶]

افتخار جالب ابہام کو نئے معانی کا نقیب جانتے ہیں۔ وہ ابلاغ کی روائتی حد بندیوں سے سروکار نہیں رکھتے۔ معانی کی سادہ، یک سطحی منطق سطحیت تک محدود ہے۔ اس کے برعکس شعری ابہام متنوع معنوی راہیں کھولتا ہے۔ ابہام کو ابلاغ کی راہ کی رکاوٹ سمجھنے والے کام چلاؤ ابلاغ کے قائل نظر آتے ہیں۔ فکری ابلاغ ابہام کی نئی صورتوں کا متقاضی ہے۔ افتخار جالب روزمرہ زبان اور ما بعد الطبعیاتی زبان میں فرق روا رکھتے ہیں۔ شاعر جس سطح پر اپنے وجود اور تشخص کا ادراک کرتا ہے اسے عمومی یا سطحی کا نام دینا ناروا ہے۔ وہ اس تناظر میں اپنے مخصوص امکان تک پہنچتا ہے۔ اس کا ادراک اس کی یکتا اور نادر حالتوں کا پردہ کشا بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے اظہار و اسلوب یا طرز بیان کے پیمانے اگر روایتی شعریات سے لے گا تو اپنی ندرت اور یکتائی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسے اس کا امکانی مقدر ایلیانیشن سے روشناس کرائے گا۔

اپنے نادر شعری تجربے کے بعد جب وہ دنیا سے ہمکلام ہونا چاہتا ہے تو زبان رجوع کرتا ہے۔ یہ عمل اسے باور کرواتا ہے کہ روزمرہ زبان اس کے تجربے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ تجربے کی گہرائی اور روائتی لسانی سطحیت سے اس کا احساس مغائرت شدت آشنا ہوتا ہے۔ وہ جس زبان میں گفتگو کرنا چاہتا ہے اس سے اس کے قاری نابلد ہوتے ہیں یوں اس کی داستان ناگفتہ یا فی بطن شاعر رہتی ہے۔ افتخار جالب کا کہنا ہے اگر کوئی اپنے مخصوص تجربے کی:

> تحریر کا فیصلہ کر ہی لے تو وہ کونسی زبان اختیار کرے گا؟ اس کے تجربے روزمرہ کے تجربے نہیں لیکن وہ روزمرہ کے لفظ لیتا ہے، انہیں مخصوص سیاق و سباق میں رکھتا ہے اور خاص ترتیب دیتا ہے تا آنکہ خاص معنی پیدا ہوجائیں۔ وہ حل طلب مسائل و اصطلاحات اور لسانی سیاق و سباق کے جدلیاتی تعامل سے آگاہ ہوکر ان پر قابو پاتے ہوئے انہیں اپنی مقصد برآری کے لئے استعمال کرتا ہے۔ روزمرہ کی زبان بچپن کے تجربات کی معنویت کے اظہار کی کفالت نہیں کرسکتی۔ روزمرہ کی زبان کے بارے میں ژاں کوکتو نے بھی اس سے مماثل بات کہی ہے۔ مزید برآں وہ انتہائی ابتدائی آگاہیاں بھی روزمرہ کی زبان کی گرفت میں نہیں آسکتیں جہاں سے فلسفہ کی میزانیت نشوونما پاتی ہے۔ پھر زبان کو بزور کام میں لانا پڑے گا چاہے اس کے لئے خود زبان کو زبان کے خلاف ہی استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس ضمن میں زبان کی کمیاں، دھندلاہٹیں اور تضادات بھی بروئے کار لانا پڑیں گے۔ [۲۷]

افتخار جالب کی نظموں کے حوالے سے بعض نقادوں نے موضوع اور ہیت کی دو گونہ بدنظمی کی بات کی ہے اور کہا ہے اس سے ادب میں بے معنویت کی داغ بیل پڑتی ہے:

> اس قدر معصوم فنی بے راہ روی کی نہیں جتنی شاید بعض اذہان کو محسوس ہوتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سماجی نقطہ نظر سے ایک انتہائی گھناؤنے جرم سے کسی طرح کم نہیں۔ کیونکہ یہ فن کا مقدس لبادہ اوڑھ کر عوام کے دل و دماغ پر ڈاکہ ڈالنے کی ایک مذموم سعی ہے۔ وہ سعی جو انہیں عملا باور کراتی ہے کہ زندگی ایک مجہول شے ہے۔ انسان اور معاشرہ انفرادی اور اجتماعی اکائیاں نہیں بلکہ چھوٹے، بڑے، بے جہت، بے وضع اور بے روپ الجھاؤ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی کوکھ سے جنم لینے والا فن بھی اَصلاً مجہولیت، بے جہتی، بے وضعی اور بے روپ پن کا مظہر ہونا چاہیئے۔ [۲۸]

افتخار جالب نے ان الزام تراشیوں کو نیتوں کا فتور نہیں سمجھا بلکہ محض غلط فہمی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان کے موقف کے مطابق لسانی تشکیلات نہ تو موضوع اور ہیت کی علیٰحدگی کو تسلیم کرتی ہیں اور نہ ہی اس ابہام سے منکر ہیں جو زندگی کا جوہر ہے۔ ابہامی جوہر کے حوالے سے جو ابلاغ کے در وا ہوتے ہیں اس کے سیاق و سباق میں وہ آر۔ ڈی لینگ اور ڈی۔ جی۔ کوپر سے استدلال لیتے ہیں کہ مابعد الطبعیاتی زبان کو روزمرہ کی زبان کے مقابلے پر زیادہ خرافات پیدا کرنے والی زبان شمار نہیں کرنا چاہیئے۔ خرافات اس وقت جنم لیتے ہیں جب زبان اور تجربے میں خلل کی خلیج پیدا ہوجائے۔ تجربے کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ہمیشہ زبان کے ذرائع کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں فرد کے بیانات کو اس کی ٹھوس میزانیت کے حوالے سے دیکھنا ہوگا۔ دوسری صورت میں ہمیں اپنی میزانیت کے حوالے سے دوسرے کو دیکھنا ہوگا جو فی الحال اپنی میزانیت کے عمل میں زندگی کر رہا ہے۔ زندگی کے پہلے سال کے تجربات کو کوئی لسانی اظہار نہیں دیا جاتا۔ قابل شناخت الفاظ بعد میں آتے ہیں لیکن قدیمی حرص، حسد، غیر کے اعضائے جسمانی کی وحشیانہ بربادی وغیرہ کے اعمال پہلے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ زندگی کے پہلے برس کے قبل لسانی تجربات بڑی عمر کے بچوں اور نوجوانوں کے ورائے لسانی تجربات کے ساتھ ایک ماقبل شعور فکر کا سلسلہ بناتے ہیں۔ یہاں پر مسئلے کی اتنی ہی تجدید کرنا ہے کہ کس طرح ان تجربات کی زبان میں قلب ماہیت کی جائے جو زبان سے باہر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ زبان ایسی معروضیت ہے جو غیر کو موقع دیتی ہے کہ وہ میری داخلی حقیقت کو اپنے استعمال میں لائے۔ نئی شاعری کی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے نزہت الماس لکھتی ہیں:

۱۹۶۸ء کے بعد ابھرنے والی نئی نسل کی نظمیں اس لحاظ سے حوصلہ افزا ہیں کہ بعض شاعروں نے خاندانی، معاشرتی، ملکی اور بین الاقوامی زندگی کے انتشار اور منفی اقدار سے اکتا کر شاعری میں مثبت قدروں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ احمد شمیم، فہمیدہ ریاض، امجد اسلام امجد، سہیل احمد، فہیم جوزی اور سعادت سعید کی نظمیں اس سلسلے میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ جیلانی کامران نے ماہنامہ شام و سحر ستمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں سعادت سعید اور سہیل احمد کو ایک نئی شعری تحریک کے بانی قرار دیتے ہوئے ان کی مثبت شعری قدروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جابر علی سید فنون (ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء) میں رقم طراز ہیں۔ ''غزل اب ہر لحاظ سے دبی دبی سی معلوم ہوتی ہے اور طاقت کے اس خلا کو نظم بآسانی پر کر رہی ہے۔ نظم کی اس جہت میں حصہ لینے والے فہمیدہ ریاض، امجد اسلام امجد، سہیل احمد اور سعادت سعید ہیں اور اس ریلے ریس کی Finishing فنون کے دو آخری شمارے ہیں جن میں نظم کی ہر ہیت مختصر، متوسط، پابند، طویل سب نے برابر حصہ لیا ہے۔ جدید تر نظم اب موضوع پر نہیں موضوع کے اندر لکھی جاتی ہے''۔

جابر علی سید نے نئی نسل کے ان شعرا کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مزید لکھا ہیکہسہیل احمد کی زرد کتاب کی پہلی نظم میں کل ۲۱ مصرعے ہیں اور کل ۲۱ قافیے (بارشوں، معبدوں، لفظوں، مکانوں) لیکن شاعر پر مرصع کاری کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ سہیل احمد کے قافیے قافیے بعد میں ہیں اور اشیا اور مناظر پہلے۔ فہمیدہ ریاض، سہیل احمد، امجد اسلام امجد اور سعادت سعید کی نظموں میں دو توجہ طلب عنصر اور بھی ہیں۔ یاد ماضی Nostalgia اور بین الاقوامیت۔ یاد ماضی کا نمائندہ لفظ رفتگاں ہے۔ جو فراق سے ہوتا ہوا ناصر کاظمی، احمد مشتاق، فہمیدہ ریاض اور سہیل احمد تک پہنچا ہے۔ فہمیدہ ریاض کی نظم تصویر میں یہ بڑی چابک دستی سے مضمر ہے۔ بین الاقوامیت ظہیر کاشمیری کے بین الاقوامی تصور سے مختلف مقصد، ہیت اور آہنگ رکھتی ہے۔ بین الاقوامی میں یہ خارجی اور تہذیبی ہے اور نئے نظم نگاروں کے ہاں داخلی اور حسیاتی۔ مندرجہ بالا شاعر نظم کے سانچوں کو تخلیقی طور پر استعمال کرنے پر قادر ہیں یا نہیں یہ علیحدہ بحث ہے لیکن ان کی نظموں کے مطالعے سے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ شاعر شعری اظہار کے ذریعے صداقتوں اور حقیقتوں کی تلاش میں مصروف ہیں۔ ان کی علامتوں میں زندگی بخش قدروں کی نشان دہی ہوسکتی ہے۔ ان کی تصویریں معاشرے کی مجرمانہ ذہنیت، تعیش پسندی، شر انگیزی اور غیر فطری صورت حال سے ان کی اکتاہٹ کی عکاس ہیں۔ ان شاعروں نے آزاد نظم کے وسیلے کو اپنا کر شاعری میں دوبارہ مسلسل اور منظّم اظہار کا سنگ بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تجربے اور واردات ان کے حواس، شخصیت اور ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو مرکزی حیثیت عطا کر کے اپنے بحران کو آفاقی اور اجتماعی تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں یوں ان کی علامتیں ذاتی یا نجی نہیں رہتیں اجتماعی اور آفاقی ہو جاتی ہیں۔ مستقبل میں اردو نظم کیا کیا صورتیں اختیار کرتی ہے اس بارے میں قبل از وقت کچھ کہنا بے سود ہے لیکن عصر حاضر کے نئے شاعر جس روش کو منتخب کر چکے ہیں اس سے انداز ہوتا ہے کہ اردو نظم ابھی ترقی اور عروج کے مزید کئی منزلیں طے کرے گی اور ہمیں فنکاروں اور شاعروں کی تخلیقی صلاحیتوں سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں اور اپنے نئے احساس، نئے شعور کے نتیجے میں نئی نئی فنی، جمالیاتی قدروں کی تخلیق ان کے پیش نظر رہتی ہے۔

حوالہ جات

۱ لا= راشد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۳۵

۲ صفدر میر، ''بیابانِ جنوں''، مشمولہ؛ نئی شاعری، مرتبہ، افتخار جالب (لاہور: ادارہ نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء) ص:۱۶

۳ سعادت سعید، ڈاکٹر، مملوکہ ''مقالات افتخار جالب افتخار جالب''، پنجر شعری ویرانے میں نئی ہریاول کی نمو، تبصرہ ''آبِ رواں''۔ ایک علامت، اشاعت ماہنامہ نُصرت، جون ۱۹۶۲ء، ص: ۳۷

۴ افتخار، جالب، ماخذ، لاہور: مکتبۂ جدید ادب، ۱۹۶۳ء، ص: ۷۸

۵ جالب، افتخار، لسانی تشکیلات اور قدیم پنجر، کراچی: فرہنگ، ۲۰۰۱ء، ص:۱۱۔۱۴

۶ افتخار، جالب، ماخذ، لاہور: مکتبۂ جدید ادب، ۱۹۶۳ء، ص:۱۱۱

۷ سجاد، سیّد، مرتبہ، نئی نظمیں، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۴۷ء، ص: ۶۷

۸ جالب، افتخار، مرتبہ، نئی شاعری، لاہور: ادارہ نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء، ص:۱۵۵

۹ افتخار، جالب، ماخذ، لاہور: مکتبۂ جدید ادب، ۱۹۶۳ء، ص:۶۴

۱۰ سجاد، سیّد، مرتبہ، نئی نظمیں ،لاہور: نئی مطبوعات ،۱۹۴۷ء،ص: ص۔ط

۱۱ سیدہ نزہت الماس، جدید اُردو نظم میں وسائل اظہار،لاہور: قلمی مملوکہ عبادت بریلوی کولیکشن جی سی یونیورسٹی لائبریری،۱۹۷۰ءص: ۲۲۰، ۲۲۱،۲۲۲

۱۲ جالب ،افتخار، مرتبہ، نئی شاعری، لاہور: ادارہ نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء،ص: ۱۲۷

۱۳ جالب، افتخار، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، کراچی : فرہنگ، ۲۰۰۱ء،ص:۲۴۸

۱۴ (ترجمہ از، سعادت سعید) The Fire And The Fountain,oxford John Press,Search Resultsuniversity press,London, 1955 , page 56

۱۵ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص: ۱۵

۱۶ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص:۱۳

۱۷ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص:۹۴

۱۸ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص:۹۴

۱۹ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص:۸۹

۲۰ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص:۸۰

۲۱ جالب ، افتخار، یہی ہے میرا سخن ، کراچی : فرہنگ،۲۰۰۴،ص:

۲۲ جالب، افتخار، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، کراچی : فرہنگ، ۲۰۰۱ء،ص:۱۳

۲۳ جالب ، افتخار، شعر گوئی ارتکاب قتل ہے ،مشمولہ : راوی ، لاہور: گورنمنٹ کالج ، ۱۹۸۹ء،ص: ۴۷

۲۴ سعید، ڈاکٹر ،لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر،مشمولہ؛ روای ،لاہور: جی سی یونیورسٹی ،ص:۴۱

۲۵ عارف عبدالمتین ، نیرنگ خیال سالنامہ۱۹۷۴ء،ص: ۶۷

۲۶ جالب ، افتخار، شعر گوئی ارتکاب قتل ہے ،مشمولہ : راوی ، لاہور: گورنمنٹ کالج ، ۱۹۸۹ء،ص: ۴۸

۲۷ سعادت سعید، ڈاکٹر ،لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر،مشمولہ؛ روای ،لاہور: جی سی یونیورسٹی ، ۲۰۰۶ء،ص:۶۴

۲۸ سیدہ نزہت الماس، جدید اُردو نظم میں وسائل اظہار،لاہور: قلمی مملوکہ عبادت بریلوی کولیکشن جی سی یونیورسٹی لائبریری،۱۹۷۰ءص: ۱۲۷

کتابیات

☆ روای ،لاہور: جی سی یونیورسٹی ، ۲۰۰۶ء

☆ سجاد، سیّد، مرتبہ، نئی نظمیں ،لاہور: نئی مطبوعات ،۱۹۴۷ء ،

☆ لا= راشد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری،لاہور: نگارشات ،۱۹۹۴ء

☆ سعادت سعید، ڈاکٹر، مملوکہ، مقالات افتخار جالب ،لاہور: شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی ،۲۰۱۲ء

☆ جالب ،افتخار، مرتبہ، نئی شاعری، لاہور: ادارہ نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء

☆ جالب، افتخار، یہی ہے میرا سخن، کراچی: فرہنگ، ۲۰۰۴

☆ جالب، افتخار، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، کراچی: فرہنگ، ۲۰۰۱ء

☆ راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۹ء

☆ مخدوم منور، نثری نظم کی تحریک، ملتان: کاروان ادب، ۱۹۸۲ء

☆ سیدہ نزہت الماس، جدید اُردو نظم میں وسائل اظہار، لاہور: قلمی مملوکہ عبادت بریلوی کولیکشن جی سی یونیورسٹی لائبریری، ۱۹۷۰ء

☆ The Meaning of Meaning: A Study of the Influence of Language upon Thought and of the Science of Symbolism (1923) was co-authored by C. K. Ogden and I. A. Richards, Magdalene College, University of Cambridge. It is accompanied by the two supplementary essays by Bronislaw Malinowski and F. G. Crookshank.

☆ Although the original text was published in 1923 it has been used as a textbook in many fields including linguistics, philosophy, language, cognitive science and most recently semantics. The book has been in print continuously since 1923. The most recent edition is the critical edition prepared by W. Terrence Gordon as volume 3 of the 5-volume set C. K. Ogden & Linguistics (London: Routledge/Thoemmes Press, 1995).